# پاکستان ایکسپریس

خشونت سنگھ

# پاکستان ایکسپریس

خشونت سنگھ

گروور پریس سے بہترین ہندوستانی افسانوی تصنیف کا
ایوارڈ یافتہ ناول

"پاکستان ایکسپریس" کا موضوع دورانِ تقسیم ہندوپاکستان کے فسادات ہیں۔ ناول پنجاب کے ایک گاؤں منو ماجرا کے گرد گھومتا ہے جس کی بیشتر آبادی سکھ ہے اور ان کے مزارعے مسلمان ہیں۔ سکھوں کے دل میں کوئی جذبۂ منافرت نہیں مگر کچھ اشتعال پسند انھیں زبردستی اشتعال کی راہ پر گامزن کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو پہلے کیمپ میں بھیجا جاتا ہے جہاں سے انھیں ایک ٹرین سے پاکستان لے جایا جاتا ہے۔ شرپسند ایک منصوبہ بناتے ہیں کہ ٹرین میں مسلمانوں کا قتل کر دیا جائے کیوں کہ پاکستان سے جو ٹرینیں آتی ہیں ان میں ہندو اور سکھ کٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ منصوبے کے مطابق کھمبے سے ایک آہنی رسّے کو نیچے گرا دیا جاتا ہے جس سے ٹرین کی چھت پر بیٹھے ہوئے مسافر از خود ختم ہو جائیں گے۔ ٹرین کی رفتار میں کچھ دھیما پن آنے سے باقی مسلمانوں کو بھی ختم کر دیا جاتا تھا۔

جس رات اس منصوبے پر عمل ہونا ہے اس سے کچھ دیر پہلے دو ملزموں کو جیل سے رہا کر دیا جاتا ہے ان میں ایک جگت سنگھ ہے جو دس نمبری بدمعاش ہے اسے تھانے میں حاضری دینی پڑتی ہے۔ دوسرا اقبال سنگھ ہے جس کے نام کی بنا پر یہ شبہ ہو گیا تھا کہ وہ مسلمان ہے اور ایم اے پاس ہے۔

حالات کی ناگزیری کو دونوں محسوس کرتے ہیں۔ اقبال سنگھ ذی علم اور دانش ور ہے لیکن ضمیر کو آسودہ کرنے کے لیے وہ شراب نوشی میں مداوا ڈھونڈ لیتا ہے۔ دس نمبری جگا پھر سے جگت سنگھ بن جاتا ہے۔ اندھیرا ہونے کے بعد وہ گرنتھی سے درخواست کرتا ہے کہ اسے گرو وانی سنائے۔ اس کے بعد وہ سگنل کے کھمبے پر چڑھ کر آہنی رسّے کو کاٹنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ نیچے سے گولیاں چلتی رہتی ہیں مگر مرنے سے پہلے وہ رسّے کو کاٹ دیتا ہے اور گاڑی بغیر کسی نقصان کے گزر جاتی ہے۔

ناول کے مطالعے کے بعد آپ خشونت سنگھ کے طرزِ نگارش کی داد تو دیں گے ہی، لیکن یہ کافی نہیں۔ بہترین داد یہ ہوگی کہ ہم اپنے دل کو ٹٹولیں۔ کسی نہ کسی گوشے میں جگت سنگھ ضرور چھپا ہوگا۔ جس طرح وہ دس نمبری جگے کے دل میں چھپا ہوا تھا۔ اگر ہمارے دلوں میں چھپا ہوا یہ جگت سنگھ بیدار ہو جائے تو موجودہ ماحول کی سب تلخیاں از خود ختم ہو جائیں گی —— صحیفے یہی کام کرتے ہیں۔ یہ ناول بھی اس قابل ہے کہ اسے صحیفے کے طور پر پڑھا جائے۔

گوپال متل

# پاکستان ایکسپریس

خشونت سنگھ

موڈرن پبلشنگ ہاوس
۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اردو روپ : مسعود منور

اشاعت : ۱۹۹۶ء
قیمت : ایک سو پچاس روپے
کتابت : سجاد علی خاں
مطبع : جے۔ اے۔ آفسیٹ پریس۔ نئی دہلی
سرورق : رزاق ارشد

زیر اہتمام
پریم گوپال متل

ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ۔ دریا گنج۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

اُس برس بہت شدید گرمی پڑی تھی ـــــ آگ برسی تھی، برکھا رُت بہت دُوری پر نظر آتی تھی، بادل اُمڈتے اور منڈلاتے ٹوٹ جاتے، پیاسی زمین اساڑھ کے بیچ میں بلبلا اُٹھتی تھی۔

یہ ۱۹۴۷ء کا عمل ہے۔ کلکتہ میں دنگے اور فسادات شروع ہو چکے ہیں اور وہاں سے یہ فسادات مشرق، مغرب اور شمال کی طرف بڑھتے ستلج عبور کر گئے ہیں۔ منو ماجرا کنارِ آب کھڑے اُن خوش بخت دیہات میں سے ایک ہے جہاں ابھی تک ان فسادات کی ہوا نہیں آئی۔

مختصر سا گاؤں منو ماجرا پورے گاؤں میں پختہ عمارتوں کی تعداد تین ہے ان میں سے ایک شاہ جی رام لعل کا گھر ہے۔ باقی دو میں سے ایک سکھوں کا گوردوارہ اور دوسری مسلمانوں کی مسجد ہے۔ ان تینوں عمارتوں کے قلب میں ایک مثلث قطعِ ارض پر مشتمل شاملات افتادہ ہے جس کے عین مرکز میں ایک گھنا اور چھتنار پیپل ایستادہ ہے۔ گاؤں کے باقیماندہ مکان تقریباً مٹی کے گھروندے ہیں کچے۔ ان مکانوں کے اطراف میں نشیب اوطان کے سامنے گزرتی گلیاں تنگ ہیں۔ یہ گلیاں آبادی سے باہر نکل کر پگڈنڈیوں میں بٹ جاتی ہیں اور گاؤں کے زرعی محیط تک پہنچ کر صرف پاؤں سے روند کر کھینچی لکیروں میں بدل جاتی ہیں۔ گاؤں کی مغربی سمت ایک بہت بڑا جوہڑ ہے اور

اس کے اردگرد ببول کے خاردار پیڑوں نے حصار باندھا ہوا ہے۔

گاؤں کے ستر پچھتر گھروں میں فقط شاہ جی کا ایک گھر ہے، جو ایک ہندو گھرانے کو اپنی باہنوں میں سمیٹے ہے۔ باقی سارے گاؤں کی نصف آبادی سکھوں اور نصف مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ سکھ مالک ہیں اور مسلمان مزارعین۔ دو چار گھر بھنگیوں کے بھی ہیں۔ ان لوگوں کا مذہبی عقیدہ غیر متعین ہے۔ یہ لوگ عیسائیوں میں عیسائی اور مسلمانوں میں مسلمان بن جاتے ہیں۔ کبھی کبھار وہ گوردوارے کی زیارت کو بھی چلے آتے ہیں۔ گاؤں میں ایک مقام ایسا بھی ہے جسے ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی سبھی تسلیم کرتے ہیں۔ وہ ہے جوہڑ کے کنارے ببول کے ایک پیڑ کے نیچے بنی چونے کے پتھر کی مٹھی۔ اسے اہلِ منواجرا ایک غیبی طاقت مانتے ہیں اور وقت بے وقت سبھی اس کی عبادت اور پوجا کرتے ہیں۔

دراصل یہ گاؤں کنارِ ستلج سے نصف میل کی دوری پر ہے۔ گاؤں کی شمالی سمت ایک میل کی دوری پر ریل گاڑی کا پُل ہے۔ عظیم دریا کا بہت عظیم پُل۔ منواجرا کی شہرت کا ایک خاص سبب ریلوے اسٹیشن کا وجود ہے۔ ریل کا پُل اکہرا ہونے کے باعث اسٹیشن پر مسافر گاڑیوں کے ٹھہرنے کے لیے جگہ بنی ہے جہاں رُک کر وہ ڈاک اور ریل گاڑیوں کے لیے راستہ دیتی ہیں۔

اسٹیشن پر کچھ ٹھیلے والے پان، بیڑی، سگرٹ، چائے، پکوڑے اور مٹھائی کے خوان سجا کر بیٹھے ہیں اور مسافروں کی ضرورتیں پوری کر رہے ہیں۔ یہاں ٹھیلوں کی تعداد محدود ہے اور ریلوے کا عملہ مختصر؛ اس لیے ہر چھوٹے موٹے آدمی کو بھی اپنے کام کی عظمت کا پورا احساس ہے۔ یوں اسٹیشن ماسٹر گاڑی آنے سے پہلے بکنگ کلرک کی ذمہ داریاں انجام دیتا اور گاڑی آجانے کے بعد آنے والے مسافروں سے ٹکٹیں وصول کر کے کلکٹر کے فرائض انجام دیتا ہے۔ تار برقی کے پیغامات کی ترسیل بھی اس کی ذمہ داری ہے اور انھیں وصول بھی وہ خود ہی کرتا ہے اور ضرورت پڑنے پر ہری جھنڈی لے کر پلیٹ فارم پر نکل آتا ہے اور ہلانے لگتا ہے ـــــ اُن گاڑیوں کو پاس کرنے کے لیے جو وہاں قیام نہیں کرتیں۔ اُس کا ایک ہی نائب اور ماتحت ہے۔ وہ دو طرفہ سگنل گراتا اور اٹھاتا ہے۔ کانٹے بدل کر انجنوں کی تبدیلی

کرواتا ہے۔ شام اُترتے ہی پلیٹ فارم پر نصب متعدد لیمپوں کو روشن کرتا ہے سگنلوں کے سبز اور سرخ شیشوں کے پیچھے لگی لوہے کی کنڈی سے المونیم کے بھاری لیمپ باندھتا اور پَو پھٹتے ہی اپنی رات کی کارگزاری کو حرفِ غلط کی طرح مٹا بھی دیتا ہے۔ منوماجرا میں بہت گاڑیاں نہیں رُکتی ہیں۔ ڈاک اور میل گاڑیاں تو بالکل ہی نہیں رُکتیں۔ مسافر گاڑیوں میں بھی ان دنوں صبح کے وقت لاہور سے دہلی جانے والی گاڑی اور سرِشام دہلی سے لاہور آنے والی گاڑی ہی چند ونٹوں کے لیے یہاں رُکتی ہے۔ یا وہ گاڑیاں رُکتی ہیں جو زیادہ ضروری گاڑیوں کو راستہ دیتی ہیں۔ سچ پوچھیں تو یہ اسٹیشن صرف مال گاڑیوں کا ہی اسٹیشن ہے یہ بات علیحدہ ہے کہ یہاں نہ تو کوئی مال لادا جاتا ہے اور نہ ہی اُتارا جاتا ہے۔ چراغ جلنے کے بعد تک گم سُم اور سائیں سائیں کرتی رات کو انجنوں کی سیٹیاں، ڈبوں کی کھڑکھڑاہٹ اور بفروں کے دھکے سنائی دیتے رہتے ہیں۔

ایک طرح سے منوماجرا کے جیون میں گاڑیوں کی بڑی اہمیت ہے۔ پَو پھٹنے سے پہلے لاہور جانے والی میل دریا کے پُل پر سے گزرتی ہے۔ ہر روز گاڑی کے پُل پر پہنچتے ہی میل کا ڈرائیور دو زور زور کی سیٹیاں مارتا ہے۔ یہ سیٹیاں سارے منوماجرا کو خواب سے بیدار کر دیتی ہیں۔ ببولوں پر کوّوں کا سرگم آغاز ہوتا ہے۔ چمگادڑیں ایک لمبی اُڑان بھر کر آرام کرنے کے لیے پیپلوں پر اُترتیں تو اپنے اپنے لیے جگہ کی تلاش میں باہم دگر آویزش شروع کر دیتی ہیں۔ مسجد کا مُلّا نمازِ فجر کے لیے کمر باندھ لیتا ہے۔ وہ بڑی عجلت میں غسل کرتا ہے قبلہ رو کھڑا ہو کر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کانوں پر جما کر لمبی دُھن میں اذان کہتا ہے۔ اللہ اکبر۔ مُلّا کے اذان ختم کر چکنے تک گوردوارے کا بھائی بستر ہی میں ڈٹا رہتا ہے۔ پھر وہ بھی اُٹھ جاتا ہے گوردوارے کے کوئیں سے پانی کی بالٹی بھر لاتا ہے۔ اس کے بعد ایک ایک کرکے پانی کی گڑویاں اپنے بدن پر ڈالتا ہے اور ایک ایک کرکے جپ جی کے مراحل کا وِرد بھی بھی کرتا جاتا ہے۔

دہلی سے آنے والی مسافر گاڑی جب ساڑھے دس بجے منوماجرا پہنچتی ہے تو سب عورتیں اور مرد اپنے اپنے کاموں میں محو ہو چکے ہوتے ہیں۔ مرد کھیتوں میں ہوتے ہیں اور

عورتیں امورِ خانہ داری یا کاتنے دُھننے کا شغل اختیار کر چکی ہوتی ہیں۔ لڑکیاں لڑکے دریا کے پاٹ کے خشک علاقے میں مویشی چرانے چلے جاتے ہیں۔ کسان اپنے بیلوں کو رہٹ میں جوت کر جب اشارے دیتے ہیں تو پانی کے سفالیں برتنوں کی قلقل اور پہیئے کی آواز تیز ہو جاتی ہے۔ آوارہ گھٹتے گارے کی دیواروں کا سہارا تلاش کرتے ہیں جبکہ چڑیاں اپنا تنازعہ ختم کرکے اور اپنے پر سمیٹ کر پیپلوں کی شاخوں کے ساتھ لٹک کر آرام کر رہی ہوتی ہیں۔

دوپہر والی ڈاک گاڑی کے گزرنے تک منوماجرا کے باشندے کھانا کھانے اور سستانے کے لیے گھر لوٹ آتے ہیں۔ لذتِ دہن کی آزمائش کے بعد تک بھگ سبھی مرد پیپلوں کے سائے میں تخت پوشوں پر بیٹھ کر بات چیت کرتے گپیں ہانکتے اونگھنے لگتے ہیں۔ لڑکے اپنے مویشیوں کو ہانک کر جوہڑوں میں لا چھوڑتے اور اُن کی پیٹھوں پر سے زقندیں بھر کر جوہڑ کے مٹیالے پانی میں کود جاتے ہیں۔ لڑکیاں پیڑوں کی چھاؤں تلے گوبھو چال یا کِکلی میٹی کھیلتی ہیں۔ عورتیں ایک دوسرے کے سر مکھن ملتیں اور اپنے بچوں کے سروں میں سے جوئیں چننے کے ساتھ ساتھ کسی کی پیدائش کسی کی موت یا بیاہ شادی کے تذکرے بھی کرتی جاتی ہیں۔

دن ڈھلے جب لاہور سے آنے والی مسافر گاڑی گزرتی ہے تو ایک بار پھر عورتیں اپنے کاموں میں معروف ہو چکے ہوتے ہیں۔ نگہبان لڑکے مویشیوں کو گھروں میں لاتے ہیں۔ جہاں دودھیلوں کو دوہ کر رات بھر کے لیے باندھ دیا جاتا ہے۔ عورتیں شام کا کھانا تیار کرتی ہیں۔ تب گھروں کے سارے لوگ چھتوں پر جمع ہو جاتے ہیں۔ جہاں موسم گرما میں وہ راتوں کو سوتے ہیں۔ اپنی اپنی چارپائی پر بیٹھ کر وہ کھانا کھاتے اور آنے والے دن کی مصروفیات پر غور کرتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد وہ کٹوروں میں بالائی دار گرم دودھ پی کر سونے کے سگنل کا انتظار کرتے ہیں جب مال گاڑی اسٹیشن پر آجاتی ہے تو سبھی "مال آگئی بھئی" کہہ کر سونے کی تیاری میں لگ جاتے ہیں۔ مُلّاجی ایک بار پھر سر لگا کر "اللہ اکبر" کی آواز بلند کرتے ہیں اور اس طرح اہلِ ایمان کو نماز پر اکساتے ہیں۔ مومنین گھروں کی چھتوں پر سے ہی حضور غیب میں آمین کی ندا بلند کر دیتے ہیں۔ گوردوارے کا بھائی کچھ سمجھدار اور بزرگ

لوگوں کو جمع کر کے، 'رہوراس' کا پاٹھ کرتا ہے۔ ببولوں میں کوّے اپنی دُھن الاپتے ہیں۔ چھوٹی خفاشیں جھٹ پٹے میں پھڑپھڑانے لگ جاتی ہیں اور بڑی چمگادڑیں لمبی اُڑان بھر کر دُور نکل جاتی ہیں۔ مال گاڑی بہت دیر تک اسٹیشن پر کھڑی رہتی ہے اور اس کا انجن پہلوکی پٹڑی پر اوپر تلے جاتا یہاں رہ جانے والے ڈبوں کو گاڑی سے علیحدہ کر کے یہاں سے آگے جانے والوں کو اس کے ساتھ جوڑ دیتا ہے۔ گاڑی کی روانگی تک بچے سو جاتے ہیں ___ اور بوڑھے بھی سونے کی تیاری میں جمائیاں لے کر کسی طول کھینچنے والی گفتگو کو سمیٹنے لگ جاتے ہیں۔ اس کے بعد منوماجرا پر چُپ کا پہرا ہوتا ہے صرف رات کو گزرنے والی گاڑیوں پر بھونکنے والے کتّوں کی آواز پہر پہر کے وقفے کے بعد اُبھرتی ہے۔

۱۹۴۷ء کے موسم گرما تک ہر نیا سورج اسی طرح طلوع ہوتا اور اسی طرح غروب ہوتا رہا ہے۔

اور پھر اُسی برس ماہ اگست کی ایک گہری رات کو پانچ افراد، منوماجرا کے نواحی ببولوں کے جھنڈ میں سے نکل کر آہستہ آہستہ دریا کی طرف بڑھتے ہیں۔ وہ ڈاکو یا پیشہ ور لٹیرے لگتے ہیں۔ ایک کے سوا چاروں مسلح ہیں۔ دو کے پاس برچھے ہیں اور دو کے کندھوں پر توڑے دار بندوقیں ہیں۔ پانچواں سکھ ہے جس کے ہاتھ میں ٹارچ ہے۔ جب وہ کنارِ آب پہنچتے ہیں تو سکھ بیٹری کا بٹن دبا کر روشنی کرتا ہے اور پھر اگلے لمحے یہ روشنی گل کر کے نہایت کھنکے کھنکے لہجے میں کہتا ہے" بس یہیں انتظار کرتے ہیں" اتنا کہہ کر وہ ریت پر بیٹھ گیا۔ باقی اُس کے اردگرد اپنے اپنے ہتھیار کی اوٹ میں دبک گئے۔

ٹارچ والے نے برچھے والے سے پوچھا، "تم بھنگے کے لیے چوڑیاں لائے ہو؟"

"ہاں، پوری درجن بھر ہیں، لال اور نیلے کانچ کی، کوئی بھی گاؤں کی مٹیار دیکھ کر مرے گی ان پر۔"

"ایک بار تو تڑپے گا جگا"۔ ایک بندوق بردار بولا۔

سردار ہنس دیا، اس نے ہاتھ کی ٹارچ ہوا میں اچھالی اور پھر دبوچ لی۔ پھر اس نے ٹارچ کو اپنے کھلے منہ میں اڑس کر بٹن دبایا۔ منہ میں ٹارچ کی روشنی سے اس کے رخسار گلابی شعاعیں چھوڑنے لگے۔

"وہ اپنی جولاہوں کی لڑکی کو بھی دے سکتا ہے" دوسرا برچھا بردار بولا۔ "وہ مکھن جیسی گداز بانہوں اور ادھ پکے آموں جیسی چھاتیوں والی ــــ کیا نام ہے اس کا؟"

"نوراں" ــــ سردار ٹارچ بجھا کر منہ سے ایک طرف ہٹاتے ہوئے بولا۔

"ہاں ــــ نوراں" برچھا بردار نے حامی بھری۔ "تم نے دیکھا تھا بسنت پنچمی والے دن اسے؟ سینے پر تنگ قمیض، پاؤں میں چھنکتی پائلیں۔ اور پھر سرا تی ہوئی سلک، ہائے!"

"ہائے" دوسرے برچھے دار کے سینے سے بھی اک ہوک اٹھی "ہائے ہائے"۔

"بہت گلچھرے اڑوائے گی جگے کو" دوسرا بندوق بردار بولا۔ "دن کے وقت دیکھو تو اتنی بھولی بھالی، جیسے ابھی دودھ پیتی بچی ہو، لیکن رات کو" اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "آنکھوں میں کاجل ڈالے بنا باہر نہیں نکلتی"۔

"کاجل آنکھوں کے لیے اچھا ہوتا ہے" ایک اور بولا "اس سے آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچتی ہے"۔

"ہاں، دوسروں کی آنکھوں کو بھی" بندوق بردار بولا۔

سبھی ہنس دیے اور پھر سردار ہوشیار ہو کر بیٹھ گیا "سنو" اس نے کہا، "مال گاڑی آگئی ہے"۔

سبھی نے ہنسنا بند کر دیا اور رات کے سناٹے میں گاڑی کی دھمک سننے لگے۔ گاڑی بالکل پاس آگئی تھی۔ ڈبے بدلنے والے انجن کی آواز بھی سنائی دینے لگی، ڈبے زور زور سے ایک دوسرے سے بج رہے تھے۔

"چلو اب دیکھیں لالے کو" سردار یہ کہہ کر پاؤں کے بل کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہمراہی کھڑے ہو کر کپڑوں سے ریت جھاڑنے لگے۔ کالی ماتا کی پوجا کر کے انھوں نے

اپنے چہرے اپنی پگڑیوں کے پلّوؤں سے ڈھانپ رکھے تھے۔ صرف ان کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔
مال گاڑی نے دو بار سیٹی بجائی اور پُل کی جانب سرکنے لگی۔
"آؤ" سردار نے کہا، اور سبھی دریا کے بند کے اوپر سے ہو کر کھیتوں کے بیچوں بیچ اس کے عقب میں چل پڑے۔ مال گاڑی کے پُل پر پہنچنے کے وقت تک وہ سب جوہڑ کے پہلو سے گزر کر گاؤں کی وسطی گلی میں نکل آئے تھے۔ آہستہ آہستہ چلتے وہ ساہوکار رام لال کے دروازے تک آئے اور رُک گئے۔ ایک بندوق بردار نے بندوق کے دستے سے دروازہ کھٹکھٹایا اور زور سے آواز دی "اوئے لالہ!"
کوئی جواب نہ ملا۔ گاؤں کے کتے ان کے قریب آ کر بھونکنے لگے۔ ایک برچھا بردار نے ایک کتے کے جسم میں برچھے کا چپٹا بلیڈ بھونک دیا۔ دوسرے نے فضا میں ایک گولی داغی، کتے چاؤں چاؤں کرتے کرتے دُور ہٹ گئے اور زیادہ شدت سے بھونکنے لگے۔
سبھی ڈاکو اپنے ہتھیاروں کے ساتھ دروازہ کھٹکھٹانے لگے۔ ایک نے تو اپنا برچھا آر پار گزار دیا "کھول دے، طوائف زادے" وہ زچ ہو کر چیخا "نہیں تو بچہ بچہ بھون دیں گے تمھارا!"
"کون ہو؟ لالہ جی تو گھر پر نہیں" اندر سے ایک نسوانی آواز آئی۔
"دروازہ کھولو، ہم بتاتے ہیں، کون ہیں ہم" سردار بولا۔
"خدا کا واسطہ لالہ جی گھر پر نہیں اور چابیاں اُن کے پاس ہیں!"
"اچھا بتاتے ہیں تمھیں" کہہ کر سبھی نے دھکے مارے اور دروازے کا فریم اُدھیڑ ڈالا۔ دروازہ چوپٹ کھل گیا۔ ایک بندوق بردار دروازے پر کھڑا ہو گیا اور باقی چاروں اندر گھس گئے۔ بیٹھک کے ایک گوشے میں دو عورتیں دُبک کر بیٹھی تھیں۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والا ایک سات سالہ لڑکا ان میں سے بڑی عمر کی عورت سے چپک کر بیٹھا تھا۔
"پرماتما کی سوگند، جو چاہے لے جاؤ، گہنے، کپڑا لتا اور سب کچھ" بوڑھی عورت

نے واسطہ دیا۔ اس کی ہتھیلیوں کے کاسے میں سونے چاندی کے کڑے کنگن، کانٹے اور بالوں میں اڑسنے والے پھول تھے۔ جو اس نے آگے بڑھا دیے۔

"لالہ کہاں ہے؟" ایک ڈاکو نے سب کچھ اس کے ہاتھوں سے چھین کر پوچھا۔

"گوروجی کی سوگند، وہ گھر پر نہیں ہمارے پاس جو کچھ بھی تھا ہم نے حاضر کر دیا ہے اس کے پاس دینے کے لیے اور کچھ باقی نہیں۔"

آنگن میں چار چارپائیاں قطار سے بچھی تھیں جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ لالہ جی گھر ہی میں ہیں۔ اس بندوقچی نے بوڑھی عورت کی گود سے بچے اُچک کر بندوق کی نال اس پر تان دی۔ بڑھیا اس کے پاؤں میں گر کر واسطے دینے لگی: "نہ مارنا بھائی، واسطہ گورو کا، نا، نا۔"

بندوقچی نے بوڑھی کو ٹھوکر رکھ کر سہمے ہوئے بچے سے پوچھا "کہاں ہے تمہارا لالہ؟"

بچہ خوف سے تھرتھراتے ہوئے بولا "چھت پر۔"

بندوقچی نے بچے کو دوبارہ بوڑھیا کی گود میں دھکیل دیا اور پھر آنگن میں سے گزرتے ہوئے سیڑھیاں چڑھتے گئے۔ اوپر ایک ہی چوبارہ تھا۔ ایک دھکے میں دروازے کو فریم سمیت اُدھیڑ کر وہ اندر داخل ہو گئے۔ کمرے میں لوہے کے ٹرنکوں کا ایک انبار تھا۔ دو پلنگ تھے جن پر لحاف تہہ کر کے رکھے گئے تھے۔ ٹارچ روشن کرنے پر شاہ جی کا سراغ مل گیا جو ایک پلنگ کے نیچے سہمے پڑے تھے۔

"گوروجی کی سوگند! لالہ جی گھر پر نہیں" ایک آدمی نے بوڑھی کی نقل اُتارتے ہوئے کہا۔ اس نے شاہ جی کو ٹانگوں سے پکڑ کر گھسیٹ لیا۔

"تجوری کی چابیاں کہاں ہیں؟" سردار نے لالہ جی کی پشت پر ٹھوکر مار کر کہا۔

لالہ منہ کے بل فرش پر گر گیا اور جیب میں سے نوٹوں کی گڈی نکال کر تھماتے ہوئے بولا۔ "یہ لو، بس یہی کچھ میرے پاس ہے" اور پھر وہ سردار کے پاؤں دابنے لگا۔

"ہم تجوری کی چابیاں مانگ رہے ہیں، نوٹ نہیں چاہئیں ہمیں۔"

"تجوری میں کچھ نہیں رہا، بس بہی کھاتوں کے سوا۔ میرا سب کچھ آپ کا ہے۔ مجھے چھوڑ دو" رام لال سردار کے پاؤں سے چپک کر آہیں بھرنے لگا "خدا کے واسطے، واہی گورو

آپ کا بھلا کریں۔"

ایک آدمی نے اس کو سردار کی ٹانگوں سے علیحدہ کرکے اپنی بندوق کا دستہ اس کے جبڑے پر دے مارا۔ ۔ ۔

"ہائے، میں مرگیا!" ہونٹوں سے لہو تھوکتے ہوئے رام لال نے کہا۔

عورتوں نے لالہ جی کی چیخ سن کر آنگن میں واویلا شروع کردیا "ڈاکو ڈاکو" آس پاس کے کتے بھونکتے رہے لیکن کوئی بندۂ خدا گھر سے باہر نہ نکلا۔ برچھیوں اور بندوقوں کی ضربیں پہنچا کر رام لال کا چوبارے میں ہی کچومر نکال دیا گیا۔ ایک برچھادار نے اس کی پسلی میں برچھا بھونک دیا "ہائے" کہہ کر وہ فرش پر ڈھیر ہوگیا۔ اس کے پیٹ سے خون کا فوارہ پھوٹ نکلا۔ ڈاکو چوبارے میں سے باہر آگئے ایک آدمی نے ہوا میں دو فائر کیے۔ عورتوں نے واویلا اور کتوں نے بھونکنا بند کردیا۔ سارے گاؤں پر چپ کی دہشت چھائی ہوئی تھی۔

ڈاکوؤں نے چھت پر سے ہی کھیتوں میں چھلانگیں لگائیں اور گاؤں والوں کو ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کے نام کی گالیاں دیتے، بیرونی سمت ایک کچے مکان کے پاس آکر خاموش ہوگئے۔ سردار رک گیا اور اس نے اپنے ایک ساتھی سے کہا، "یہ آگیا جگے کا گھر بھی۔ اس کی نذر فراموش نہ ہوجائے اسے چوڑیاں دیتے جائیں۔"

ایک برچھا بردار نے اپنی تہمد کی ڈب میں سے ایک پوٹلی نکالی اور دیوار کے اوپر سے اندر پھینک دی۔ جگے کے آنگن میں پوٹلی گری تو کانچ کے ٹوٹنے کا چھناکا گونجا۔

"اوئے جگیا" برچھا بردار کی آواز ابھری "جگیا!" اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھ مار کر ایک اور پکار کی "پہن لے چوڑیاں، جگیا! چڑھالے یہ چوڑیاں اور اپنے ہاتھوں کو مہندی لگالے۔"

"جانے دے دیا جولاہوں کی بیٹی کو" ایک بندوق بردار نے چیخ کر کہا۔

"ہائے" دوسروں نے آہ بھری "ہائے! ہائے!!" انھوں نے مزہ لیتے ہوئے دوبارہ پکار کی، بغلیں بجاتے ہوئے وہ دریا کی طرف نکل گئے۔ جگے نے کوئی جواب نہ

دیا۔ اس نے انھیں سنا ہی نہیں تھا۔ وہ تو گھر میں ہی نہ تھا۔

جگا گھر میں نہیں تھا۔ وہ ایک گھنٹہ پیشتر گھر سے چلا گیا تھا۔ وہ بھی ڈاکوؤں کی طرح مال گاڑی کی آمد کے وقت ہی نکلا تھا کیوں کہ مال گاڑی کے آجانے کے بعد کوئی دوسرا اپنے گھر سے باہر نہیں نکلتا تھا۔ گاڑی کی پہلی آواز کے ساتھ اس نے اپنے بستر سے اٹھ کر اپنی پگڑی سر پر لپیٹی اور باہر کی جانب چل دیا تھا۔ جاتے جاتے اس نے چارہ رکھنے کے مخصوص گوشے سے برچھا بھی نکال لیا تھا۔ ابھی وہ دروازے تک بھی نہیں پہنچا تھا کہ اسے "کہاں جا رہے ہو اتنی رات گئے" کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ تھم گیا۔ اس کی ماں نے ٹوک دیا تھا۔ "کھیتوں کو جا رہا ہوں"۔ وہ بولا۔ "کل رات سوروں نے ساری فصل کا ستیاناس کر دیا تھا"۔

"سور؟" ماں بولی "زیادہ ہوشیار بننے کا ناٹک نہ کرو۔ تمھیں یاد نہیں رہتا کہ تم پولیس کی نگرانی میں ہو؟ تمھیں طلوع سے پہلے گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہیے اور پھر برچھا لے کر، دشمن دیکھ لیں تو رپورٹ کر دیں گے۔ پھر سے تجھے جیل بھجوا دیں گے"۔ اس کی آواز روہانسی ہو گئی تھی۔ "مال مویشی اور کھیتی باڑی کو تمھارے پیچھے کون سنبھالے گا؟"

"میں ابھی لوٹ کر آیا۔ فکر مت کرو" جگا بولا "سو رہا ہے سارا گاؤں"۔

"نہیں بیٹا نہیں" اس کی آواز آنسوؤں سے بھیگ گئی تھی۔

"چپ رہ" جگے نے اسے سرزنش کی "تمھارے بینوں سے لوگ اٹھ جائیں گے"۔

"جاؤ، جاؤ جہاں جاتے ہو، مرو جہنم میں مرنا چاہتے ہو، باپ کی طرح ایک دن سولی پر لٹکو گے، میرے نصیب میں آنسو ہی لکھے ہیں" ماں نے سر پر دو ہتڑ مار کر کہا "میری قسمت ہی خراب ہے شاید"۔

جگے نے دروازہ کھولا اور اپنے اطراف میں نگاہ ڈالی۔ قرب و جوار میں کوئی نہ تھا۔ جوہڑ تک وہ دیواروں کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

دبے پاؤں وہ گھر سے باہر نکل گیا۔ اس کے بعد وہ ہل چلے کھیتوں میں سے ہوتا ہوا دریا کے سمت نکل گیا۔ دریا کنارے کی ریت عبور کر کے وہ بہتے پانی کے پاس آ گیا۔ اپنے

برچھے کو زمین میں اُلٹا گاڑ کر، وہ خود ریت پر ٹانگیں پسار کر پڑ گیا۔ پیٹھ کے بل لیٹا وہ تاروں کی سمت دیکھتا رہا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک تارا ٹوٹا جو کہکشاؤں میں سے گزرتا اپنے پیچھے چاندی کا ایک تار چھوڑتا' نیلے کالے آسمان میں روپوش ہو گیا۔

"بوجھو تو کون ؟" اچانک ہی کسی نے اس کی آنکھوں پر ہاتھ دھر کے پوچھا۔

جگّے نے اپنی بائیں عقبی سمت مڑ کر ٹٹولتے ہاتھ کیا لیکن کچھ سمجھ میں نہ آسکا اور پھر وہ اپنی آنکھوں پر پھیلے ہاتھوں سے شروع ہو کر آنکھیں بند کرنے والے کے چہرے تک ٹٹولتا چلا گیا۔ بڑے قرار سے اس نے اُن رُخساروں' آنکھوں اور ناک کو ٹٹولا جنھیں وہ بہت اچھی طرح پہچانتا تھا۔ یہ نوراں کی نشانیاں تھیں۔ اس نے اپنی انگلیوں سے اس کے ہونٹ سہلائے تاکہ وہ اس کے پوروں پر ایک بوسہ ثبت کر سکے؛ لیکن نوراں نے اس کی انگلیوں میں ایک دانت گڑو دیا اس سے بے سدھ پڑے جگّے کو غصہ آگیا۔ اُس نے نوراں کے سر کو دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیا اور اس کے منہ کو اپنے مُنہ کے قریب لے آیا اور پھر آہستہ آہستہ اُس کے جسم کو بھینچا۔ نوراں کا انگ انگ جگّے کے چنگل میں تھا۔

مال گاڑی کے انجن نے دو بار سیٹیاں دیں۔ اور گھڑ گھڑ، شائیں شائیں کر کے چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ جوہڑ سے بگلوں نے پرواز کی اور دریا کی طرف منڈلاتے چلے گئے اور پھر کئی اِدھر اور کئی اُدھر پرواز کرتے رہے، یہاں تک کہ انجن کی آواز معدوم ہو گئی۔

جگّے کے ہاتھ نوراں کے چہرے اور پھر چھاتیوں کے اوپر سے سرسراتے پہلوؤں کی طرف رینگ گئے۔ نوراں ہشاش بشاش رہی لیکن وہ باز نہ آیا اُس نے نوراں کا مزاحمت کرنے والا ہاتھ بھی قبضے میں لے لیا اور پھر نوراں کے "نہ، نہ" کے درمیان جگّے نے اسے اپنے آپ میں انڈیل لیا۔

"نہ" نوراں نے بے بس ہو کر کہا اور چپ ہو گئی۔

گاؤں میں گولی چلنے کی آواز آئی۔ بگلے اور کوے اِدھر اُدھر اُڑنے لگے۔

جگے نے ذرا رک کر گاؤں کی سمت دیکھا۔ نوراں اس کی گرفت سے نکل کر اپنے کپڑے سنوارنے لگی۔ کوّے پھر سے بوٹوں پر بیٹھ گئے۔

" یہ گولی چلنے کی آواز تھی " ہراساں نوراں نے کہا۔ " اپنے گاؤں ہی میں چلی ہے کہیں۔"

" میں نہیں جانتا، مگر تم کہاں بھاگ چلی ہو خواہ مخواہ " اتنا کہہ کر جگے نے پھر سے نوراں کو کھینچ کر اپنی سانسوں کے نشانے پر لے لیا۔

" یہ دل لگی کا وقت نہیں جگے!" گاؤں میں قتل کی دہشت پھیلی محسوس ہوتی ہے۔ میرے اباجی کی آنکھ کھل گئی تو مجھے تلاش کریں گے۔ میں تو چلی ہوں گھر ابھی۔"

" نہیں، نہیں، تم نہیں جا سکتیں، کہہ دینا کسی سہیلی کے ہاں تھی۔"

" یوں حماقت نہ بگھارو، کتنے ـــــ"

جگے نے اس کا منہ بند کر کے اسے پھر اپنی گرفت میں لے لیا۔ نوراں کا وسیلی بدن ایک بار پھر جگے کی بانہوں میں کستا چلا گیا۔

" مجھے جانے دو، میں نہیں ـــــ"

نوراں خود کو رہائی نہ دلا سکی، شاید رہائی کی خواہش مند بھی نہیں تھی۔

" گاؤں سے گولی چلنے کی آواز پھر آئی ہے " نوراں نے گھٹی گھٹی سی آواز میں پھر کہا۔

" کوئی گولی نہیں چلا، یوں ہی بے سبب خوف سے پگھلی جا رہی ہو " ایک تھکے ہوئے محنت کش کے سے لہجے میں جگا بولا۔

پھر انھیں کسی کے بین سنائی دیئے تھے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ٹھائیں! ٹھائیں! دو گولیاں اور چلیں۔ کوّے۔ بوٹوں میں سے کائیں کر کے اڑ گئے۔

نوراں رونے لگ گئی " گاؤں میں کچھ ہو گیا ہے۔ میرے ابا بیدار ہو گئے ہوں گے اور مجھے تلاش کریں گے۔ وہ مجھے مار ڈالیں گے، گلا گھونٹ کر۔۔۔۔"

لیکن جگا نوراں کی فریاد پر کان نہیں دھر رہا تھا۔ وہ یہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیا کرے، اگر اس کے گاؤں سے باہر نکل جانے کا علم ہو گیا تو پولیس اسے پھر آ کرے جائے گی۔

اپنے سے زیادہ اُسے نوراں کی فکر تھی۔

"میں پھر تم سے نہیں ملوں گی" خدا اس بار کی میری اس لغزش سے چشم پوشی کرے۔ میں پھر نہ کروں گی یہ کام"۔

"تم خود ہی خاموشی اختیار کرتی ہو یا میں کراؤں تمھیں چپ؟" جگے نے گھور کر کہا۔ نوراں سسکیاں بھرنے لگی۔ "چپ! کوئی آرہا ہے ادھر" جگے نے نوراں کے منہ پر ہاتھ دھر کر کہا۔

اُن سے کچھ قدموں کے فاصلے پر برچھیوں اور بندوقوں سے لیس پانچ آدمی گزرے، انھوں نے اپنے چہروں سے پلو ہٹا دیے تھے۔ اور باتیں کرتے جا رہے تھے۔

"ڈاکو! تمھارے شناسا ہیں" نوراں نے آہستہ سے پوچھا۔

"ہاں" جگے نے جواب دیا۔ "نارچ والا ملی ہے" ملی کا نام لیتے ہی اُسے غصہ آگیا۔ "اپنی بھی کا یار" جگے نے دبی آواز میں کہا، "سو بار کہا ہے اس سے ــــ یہ ڈکیتیوں کے دن نہیں اور اب یہ حملہ آور ہوا ہے میرے ہی گاؤں پر، دیکھ لوں گا اس سالے کو......"

"تو تھانے میں رپورٹ لکھواؤ گے ان کے خلاف؟"

"تجھے کیا لینا ہے رپٹ سے؟ چل ہم گھر کو چلیں ــــ کہیں گاؤں والے مجھے تلاش نہ کرتے ہوں"۔

یہ جوڑا گاؤں کی سمت ہولیا۔ جگا آگے آگے تھا اور نوراں چند قدم پیچھے ــــ وہ عورتوں کے رونے پیٹنے اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سن رہے تھے۔

چھتوں پر کھڑی عورتیں ایک دوسری کو آوازیں دے رہی تھیں۔ سارا گاؤں جاگ اٹھا تھا۔ جوہڑ کے پاس پہنچ کر جگے نے نوراں سے کہا، "کل آؤگی نا؟" "ضرور آنا!"

"تجھے کل کی پڑی ہے، مجھے اپنی زندگی کا بھروسہ نہیں، کسی کی جان جاتی ہے تو جائے مگر تم کل کی فکر میں گھلتے رہتے ہو"۔

"تمھیں میرے جیتے جی، کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کسی میں اتنا دم نہیں کہ تمھاری طرف آنکھ بھی اٹھا سکے۔ میں نے بلاوجہ اپنے پر بدمعاش کا لیبل نہیں لگوایا، نوراں!" اس نے

ہنستے ہوئے کہا۔ "تم پر جو گزرے، مجھے کل اس سے آگاہ کرنا نہیں تو یہ فتنہ فساد ختم ہونے کے بعد بس اسی وقت، مال گاڑی آجانے کے بعد، اچھا؟"

"نہیں، نہیں، میں نہیں" فوراں نے کہا "میں کیا کہوں گی اپنے ابا سے جا کر؟ اس غل غپاڑے نے بیدار کر دیا ہوگا انھیں؟"

"کہہ دینا، رفع حاجت کے لیے گئی تھی۔ پیٹ میں درد تھا، کچھ ایسا ہی بہانہ تراش دینا۔ کہہ دینا گولی چلنے کی آواز سن کر رکی اور اس شور و غل کی آواز بند ہونے تک بیٹھی کی بیٹھی رہی۔ پرسوں آؤ گی نا؟"

"نہیں" کہہ کر وہ چل دی۔ بہانہ شاید کارگر ثابت ہو، وہ سوچ رہی تھی۔ اس کے ابا نابینائی کی حد تک پہنچ چکے تھے۔

وہ اندھیرے میں چلتی چلی گئی۔ جگا پگڈنڈیاں پھاندتا اپنے گھر پہنچ گیا۔ دروازہ کھلا تھا اور کئی لوگ اس کی ماں سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ اُلٹے پاؤں دریا کی طرف واپس آگیا۔

ریلوے اسٹیشن کے علاوہ منو ماجرا کے لوگوں کا طرۂ امتیاز ڈاک بنگلہ بھی تو ہے۔ جو پل کے شمالی علاقے میں تعمیر ہوا تھا۔ یہ کاکیائی رنگ کی اینٹوں سے بنا ایک فراخ چھت والی عمارت ہے، جس کا برآمدہ دریا کی سمت کھلتا ہے۔ یہ عمارت ایک مربع رقبے پر استوار ہے۔ یہ اپنے پہلوؤں کی جانب بہت کوتاہ لگتی ہے۔ اس بنگلے کے اندر گلاب، یاسمن اور کئی طرح کے آرائشی پودے لگے ہوئے ہیں۔ یہ بنگلہ پل کی تعمیری ضرورت کے تحت بڑے انجینئر کی قیام گاہ کے طور پر تعمیر کیا گیا تھا۔ بعد میں یہ تمام افسروں کی مشترکہ جائداد قرار پایا۔ کنارِ آب ہونے کی بنا پر یہ بنگلہ جالندھر اور انبالہ دونوں کی قسمتوں میں یکساں مشہور و مقبول ہے۔

سارا سال اس بنگلے میں بڑی رونق رہتی۔ سبھی بڑے افسر جب دورے پر آتے

تو گھڑی دو گھڑی یا گاہے پورا دن یہیں آرام کر لیتے تھے۔ مون سون کے آغاز کے ساتھ ہی آنے جانے والوں کی تعداد بے حد بڑھ جاتی۔ ستلج کی بلند ہوتی سطح آب بے حد مُنہ زور اور دلکش نظر آتی۔

منوا جبرا میں ڈکیتی کی واردات سے ایک صبح پہلے یہ بنگلہ کسی بڑے مہمان کے خیر مقدم کی غرض سے آراستہ کیا گیا تھا۔ خاکروب نے کمرے صاف کر کے فرش پر پانی کا چھڑکاؤ کیا۔ بیرے اور اس کی جورو نے میز کرسیوں کو جھاڑا پونچھا اور ٹھیک جگہوں پر جمایا۔ خاکروب زادے نے پنکھے کی چھت سے بندھی رسی کھول کر دیوار سے منسلک چرخی میں سے گزاری اور بیرونی برآمدے میں لے آیا۔ جہاں بیٹھ کر اسے رسی کو کھینچنا اور پنکھے کو متحرک رکھنا تھا۔

ایک ساعت بعد ایک فاختئی رنگ کی لمبی امریکی ساخت کی کار بنگلے میں داخل ہوئی۔ اگلی نشست سے اُٹھ کر اردلی باہر نکلا اور عقبی نشست کا دروازہ کھولا۔ تھانیدار اور سپاہیوں نے اٹن شن کھڑے ہو کر آنے والے مہمان کو سلیوٹ عرض کیا۔ گاؤں کے باشندے انتہائی احترام اور دہشت کے سبب پیچھے پیچھے ہٹ گئے۔ بیرا ڈاک بنگلے کے بڑے کمرے کا جالیدار دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔ کار کی عقبی نشست سے شری حکم چند جی اپنے بھاری بھر کم جسم کے ساتھ برآمد ہوئے۔ آپ علاقے کے افسر انتظامیہ اور ضلعی ڈپٹی کمشنر تھے۔ ان کے ہونٹوں میں دھیرے دھیرے سلگتی سگریٹ دبی تھی اور دائیں ہاتھ میں سگرٹوں کا پیکٹ اور ماچس تھی۔

ڈپٹی صاحب نے تھانیدار کے شانوں کو تھپتھپایا اور اسے بازو سے پکڑ کر اپنے ہمراہ اندر لے گئے۔ بیرا اور ڈپٹی صاحب کا نجی ملازم ان کے پیچھے پیچھے تھے۔

سپاہیوں نے ڈرائیور کے ساتھ مل کر کار میں سے سارا سامان نکالا اُدھر ڈپٹی صاحب منہ ہاتھ دھو کر آرام کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔ خاکروب زادہ پنکھے کی رسی کو متحرک رکھ رہا تھا۔ ایک اردلی نے ڈپٹی صاحب کے بوٹ اور جرابیں کھول کر ان کے پاؤں دھلوانے شروع کر دیے تھے۔ ڈپٹی صاحب نے سگریٹ کا پیکٹ کھول کر تھانیدار کی طرف بڑھایا۔ تھانیدار نے پہلے ڈپٹی صاحب کی سگریٹ سلگائی اور پھر اپنی۔

مختصر سی کاری سی بات چیت کے بعد ڈپٹی صاحب نے پاؤں دابتے اردلی کو وہسکی کی بوتل لانے کا حکم دیا۔ نومولود پاکستان میں ہندوؤں اور سکھوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کا تذکرہ کرکے ڈپٹی صاحب نے تھانیدار کو حکم دیا کہ اس سمت سے جانے والے مسلمانوں کو کسی قسم کا سامان لے جانے کی اجازت نہ دی جائے۔

بیرے نے وہسکی کی ایک بوتل لاکر ڈپٹی صاحب اور تھانیدار کے آگے دو گلاسوں میں انڈیل دی۔ گھونٹ بھرے حلق تر کرکے تھانیدار نے اپنی کلاہ دار پگڑی اتار کر ایک سمت رکھ دی۔

"منوماجرا کے حالات تو درست ہیں نا؟" ڈپٹی صاحب نے پوچھا۔

"تا حال تو سب ٹھیک ہے۔ نمبردار ہر روز رپورٹ فراہم کر رہا ہے۔ گاؤں میں اس وقت تک کسی مہاجر نے بھی قدم نہیں رکھا۔ میرا خیال ہے کہ ابھی تک کسی کو یہ بھی علم نہیں کہ انگریز چلے گئے ہیں اور دیش کے دو ٹکڑے ہو گئے ہیں۔ کسی کسی نے گاندھی جی کا نام تو سن رکھا ہے لیکن جناح سے' میرا اندازہ ہے' کوئی واقف نہیں۔ منوماجرا جیسے گاؤں میں کسی کو کیا علم ہو سکتا ہے' بڑی سرکار؟"

"بہت اچھی بات ہے۔ آپ منوماجرا کو نگرانی میں رکھیں۔ یہ سرحد پر بہت اہم مقام ہے اور پل سے بہت قریب ہے اور گاؤں میں کوئی غنڈہ یا بدمعاش تو نہیں؟"

"ایک ہی ہے' جناب' وہی جگا' جسے آپ نے گاؤں میں پابند کر رکھا ہے۔ آپ کے حکم کے مطابق وہ ہر روز نمبردار سے ملاقات کرتا ہے اور ہفتے میں ایک بار تھانے میں بھی حاضری دیتا ہے۔ خطرے کی کوئی بات نہیں۔"

"جگا؟ کون جگا؟"

وہ جگت سنگھ حضور' ڈاکو عالم سنگھ کا بیٹا' وہی عالم سنگھ جسے دو سال قبل آپ نے پھانسی کی سزا دی تھی۔ وہ سانڈ جیسا جگا ہے' علاقے کا سب سے کشیدہ قامت آدمی۔ کوئی چھ فٹ چار انچ۔"

"ہاں' ہاں' میں جانتا ہوں اُسے' وہ کوئی بدمعاشی نہیں کرتا' یہ کیسے ممکن ہے؟

وہ تو ہر ماہ کسی نہ کسی کیس میں آجاتا تھا میرے پاس۔"

"آپ نہیں جانتے سرکار اس بھید کو، آج کل اسے لوٹ کھسوٹ اور ڈکیتیاں بالکل ہی بھول گئی ہیں، سرکار جو کچھ پنجاب کی پولیس نہیں کر سکی، ایک سولہ سالہ لڑکی کے جادوئی نینوں نے کر دکھایا ہے۔"

"اس کا یارانہ ہے کسی سے؟" ڈپٹی صاحب نے وسکی کا ایک گھونٹ لے کر پوچھا۔

"جی حضور، مسلمان جولاہے کی بیٹی ہے، رنگ تو اس کا سانولا ہے لیکن آنکھیں اس کی گہری سیاہ ہیں۔ وہ نابینا باپ کی بیٹی ہے، مسجد کے ملّا کی ...... بس اسی سٹیار کے جادو نے ......؟"

"ویری گڈ۔ اچھا اپنا کیا پروگرام ہے شام کا؟ ہے کوئی" ڈپٹی صاحب نے تھانیدار کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں نہیں جناب؟ بھلا میں یہ کیسے فراموش کر سکتا ہوں؟ ایک نمبر چیز ہے اگر من پسند نہ نکلے تو مجھے نوکری سے برخاست کر دیجیے گا۔ میں ڈرائیور کو بھیجتا ہوں کار دے کر۔"

تھانیدار باہر آگیا اور ڈپٹی صاحب آرام فرمانے لگے۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر ڈرائیور کار لے کر واپس آگیا۔ ڈپٹی صاحب نہا دھو کر تیار ہو چکے تھے۔ انھوں نے کار کو ڈاک بنگلے میں داخل ہوتے اور رکتے دیکھا۔ اس میں سے دو آدمی اور دو عورتیں برآمد ہوئی تھیں۔ ایک آدمی کے پاس ہارمونیم تھا اور دوسرے کے پاس طبلوں کی جوڑی۔ عورتوں میں سے ایک عمر رسیدہ تھی جس کے بال حنا سے رنگے ہوئے تھے۔ دوسری ایک سٹیار تھی، جس کا منہ پان سے بھرا تھا۔ اور جس کی ناک میں ایک لونگ تھی، جس میں جڑا ہیرے کا نگینہ جگمگ کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی تھی جس میں بندھے گھنگھرو بار بار چھنک اٹھتے تھے۔ سب کے سب دری پر چوکڑی مار کر بیٹھ گئے۔

ڈپٹی صاحب نے بڑے غور سے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا انھوں نے اپنی خضاب زدہ مونچھوں کی تہ میں سفیدی لرزتی دیکھی تھی۔ انھوں نے ایک سگریٹ سلگائی اور رسما ہاتھ میں

سگرٹوں کا پیکٹ بھی تھام لیا۔ تب انھوں نے بڑے کمرے کا دروازہ کھولا جہاں گانے بجانے والی پارٹی بیٹھی تھی۔ جالیدار دروازے کو ذرا سا وا کرکے انھوں نے بیرے کو مزید وہسکی لانے کے لیے آواز دی۔ بڑے کمرے میں بیٹھے سبھی لوگ ہوشیار ہوگئے اور ڈپٹی صاحب دھیرے دھیرے اپنے بوٹوں سے چیخوں کی آواز پیدا کرتے اندر آکر بید کی کرسی پر بیٹھ گئے۔

ایک بار پھر سب نے ڈپٹی صاحب کو سلام کیا۔ طبلچی اور باجے والے نے قدرے خمیدہ ہوکر اور بڑھیا نے "حضور کی شہرت اور اقبال بلند رہیں۔ سرکار کی قلم لاکھوں، ہزاروں پر چلے" کہہ کر اور مٹیار نے صرف اپنی سرمے اور کاجل سے سجی آنکھیں اُن پر تان کر۔

ڈپٹی صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ چاروں کے چاروں بیٹھ گئے۔

بیرے نے اپنے مالک کے گلاس میں وہسکی انڈیل کر سوڈا ڈالا۔ ڈپٹی صاحب نے ایک بڑا سا گھونٹ لے کر اپنا اُلٹا ہاتھ مونچھوں پر پھیرا اور پھر تاؤ دیا۔ رقاصہ نے بقچی میں سے گھنگھرو نکال کر اپنے ٹخنوں سے باندھے۔ باجے والے نے باجے پر دُھن چھیڑ دی۔ طبلچی نے اپنے طبلوں کو چاروں سمت سے ٹھونک بجا کر اُن کی طنابیں کس لیں اور ہارمونیم کی دُھن پر سنگیت دینے لگا ـــــ سارا طائفہ تیار ہوگیا تھا۔

"کیا سنیں گے غریبوں کے پروردگار؟ پکا یا عشقیہ؟"

"پکا وکا نہیں چلے گا، کوئی فلمی ہو جائے ـــــ ہو سکے تو پنجابی۔"

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر سرکار" رقاصہ نے خمیدہ ہوکر کہا۔

گلوکاروں نے سر جوڑ کر باہم مشورہ کیا اور اپنے فیصلے سے رقاصہ کو مطلع کرکے وہ سازوں کو چھیڑنے لگے۔ دو چار شدت کے ہاتھ مار کر طبلہ نواز نے دھیرے دھیرے باجے کی آواز سے گت ملائی۔ کچھ دیر یوں ہی وہ سُروں کو ایک دوسرے کا ہم نوا بناتے رہے اور لڑکی انھیں دیکھتی رہی۔ اس کے بعد لڑکی نے کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا، بایاں ہاتھ کان پر دھرا اور دوسرا ڈپٹی صاحب کی سمت دراز کیا اور تان لگا کر گانے لگی:

میرے ہنجواں توں پچھو، میرے ہوکیاں توں پچھ
اسیں پیار دے دیار چوں کیہ کھٹیا؟
میرے ہنجواں توں ... ...
مل نت دی جدائی، کھاں وینداں دہائی
نیاں اؤ پدر جانیاں نے مار گھتیا
میرے ہنجواں توں ... ...

لڑکی نے گیت ختم کیا تو ڈپٹی صاحب نے پانچ کا ایک نوٹ دری پر پھینک دیا۔ رقاصہ اور سازندوں نے بڑی عقیدت سے اپنے سر خم کر دیے۔ بوڑھی کھوسٹ نے نوٹ اٹھا کر اپنی جھولی میں ڈال لیا اور بولی "حضور کا راج دربار قائم، حضور کا قلم لاکھوں، ہزاروں پر چلے، حضور ... ..."

گانا بجانا دوبارہ شروع ہو گیا۔ حکم چند نے وہسکی کا ایک بھرپور پیگ بنایا اور غٹاغٹ حلق میں انڈیل لیا۔ پھر اس نے اپنی مونچھوں کو سہلایا۔ اس کی نگاہیں رقاصہ پر جم نہیں پا رہی تھیں۔ وہ کچھ اس طرح کا گیت گا رہی تھی۔

ہوا میں اڑتا جائے
مورا لال دوپٹہ ململ کا
ہوجی، ہوجی

یہ گیت ڈپٹی صاحب کی بیٹی، اپنے گھر میں گنگنایا کرتی تھی، ڈپٹی صاحب کو ایک گونہ بے چینی کا احساس ہونے لگا۔ اس نے وہسکی کا ایک اور پیگ حلق میں انڈیلا اور اپنے ضمیر کا آئینہ صیقل کر لیا۔ ہوجی، ہوجی کی آواز کے ساتھ اس نے اپنی انگلیاں مٹکا کر اور اپنی رانوں پر ہاتھ مار کر وقت بتانا شروع کر دیا۔

جب تاریکی اترنے لگی تو ملازم نے ایک لالٹین روشن کر کے وہاں لا رکھی۔ ڈپٹی صاحب نے لڑکی کو بڑے غور سے دیکھا وہ ابھی بچی ہی تھی، بھولی اور معصوم سی۔ اس کی چھاتیاں بریسیئر پر پوری نہیں اتر رہی تھیں۔ وہ شاید اس کی اپنی بیٹی سے بھی کم عمر تھی۔ اس

نے اس خیال کو وہسکی کے ایک اور پیگ سے محو کر دیا۔

دھندلائی نگاہ سے ڈپٹی صاحب نے پھر اس رقاصہ کے چہرے پر نظر ڈالی۔ وہ طوائف نظر آ رہی تھی۔ اس کی سیاہ چنریا پر سلمے ستارے کی کہکشاں جھلملا رہی تھی۔ اس کے لونگ میں جڑا ہوا ہیرا جگمگ کر اٹھتا تھا۔ ڈپٹی صاحب نے ایک پیگ اور انڈیل کر کچھ شبہات بھی مٹا دیے۔ اس بار اس نے اپنی مونچھیں ریشمیں رومال سے پونچھیں اور قدرے اونچے سُروں میں گنگنانے لگا اور پھر جب رقاصہ نے "سنڈے کے سنڈے، میری جان!" گایا تو ڈپٹی صاحب واہ واہ! کرنے لگ گئے اس بار انھوں نے پانچ کا نوٹ دری پر نہیں پھینکا بلکہ لڑکی کو اپنے پاس بلایا۔

لڑکی کچھ تذبذب میں تھی۔ بڑھیا نے اسے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

"جاؤ! سرکار بلا رہے ہیں"

مجبوراً لڑکی ڈپٹی صاحب کی میز کے پاس چلی گئی۔ اس نے نوٹ پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو ڈپٹی صاحب نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ کر نوٹ اپنے سینے پر دھر لیا اور پھر نہایت بھونڈی آواز میں کھلکھلایا بے بسی سی ہو کر لڑکی بغلیں جھانکنے لگی۔ ڈپٹی صاحب نے نوٹ میز پر رکھ دیا وہ اٹھانے لگی تو نوٹ اس نے پھر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ رقاصہ واپس لوٹ گئی، ڈپٹی صاحب نے تیسری بار نوٹ آگے بڑھایا۔

"جاؤ! سرکار کے پاس" بڑھیا نے لڑکی کو سمجھایا۔

لڑکی کہا مان کر چلی گئی، ڈپٹی صاحب نے اپنا بازو اس کی کمر کے گرد حمائل کر کے کہا۔

"تم بہت اچھا گاتی ہو؟"

لڑکی آنکھیں تان کر اپنے ہمراہیوں کی طرف دیکھنے لگی۔

"سرکار سے بات چیت کیوں نہیں کرتی" بڑھیا نے جھڑکا۔

"لڑکی ابھی کم سن ہے، سرکار! ابھی شرماتی ہے، سیکھ جائے گی"

حکم چند نے گلاس میں وہسکی ڈال کر لڑکی کو دینا چاہا تو بڑھیا نے پھر کہا " سرکار یہ کچھ نہیں جانتی، ابھی سولہ ہی سال کی تو ہے بے چاری، اس نے کچھ نہیں دیکھا میں تو یوں ہی آپ

کی خدمت میں لے آئی ہوں اسے۔"

"چلو، گوشت تو کھاؤ" بڑھیا ہنس پڑی۔

ڈپٹی صاحب نے بڑھیا کی بات سنی ان سنی کر کے گوشت کا ایک نوالہ لڑکی کے منہ میں ڈال دیا جسے وہ کھانے لگی۔

ڈپٹی حکم چند نے اسے اپنی رانوں پر بٹھا لیا اور اس کے بالوں سے کھیلنے لگا اور پھر اس نے لڑکی کے تیل سے شرابور بالوں میں سے ایک کلپ کھینچ لیا۔ جس سے لڑکی کے بال اس کے شانوں پر بکھر گئے۔

سازندوں اور بڑھیا نے اٹھ کر جانے کی اجازت مانگی "ہمیں اجازت ہے جناب؟"

"ہاں، ہاں، ڈرائیور آپ کو کار میں چھوڑ آئے گا۔" ڈپٹی صاحب نے نوٹوں کی ایک گڈی دے کر انھیں چلتا کر دیا۔

رقاصہ ڈپٹی صاحب کی رانوں کے درمیان تھی اور بیرا حکم کے انتظار میں "کھانا لگا دوں صاحب؟" بیرے نے ڈپٹی صاحب کو اردو بولتے سن کر اردو میں کہا۔

"نہیں، تم سب یونہی چھوڑ کر چلے جاؤ۔ ہم خود ہی لگا لیں گے، ہاں جاؤ۔"

بیرا چلا گیا، اسٹیشن کی جانب سے مال گاڑی کی سیٹیاں سنائی دیں اور پھر پل کے اوپر سے گزرنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ لوگوں کے نیند میں اتر جانے کا لمحہ آن پہنچا تھا۔ ڈپٹی صاحب اپنے طور پر خود کو محفوظ خیال کرنے لگے۔

ڈپٹی صاحب ابھی لڑکی سے کھلنے کی کوشش ہی کر رہے تھے کہ منو ماجرا سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ اس پر ذرا دونوں سہم گئے۔ لڑکی کو ڈپٹی صاحب کے منہ سے وہسکی، تمباکو اور پیاز کی ناگوار باس آنے لگی تھی۔ کچھ دیر بعد گاؤں کی طرف سے لوگوں کے بولنے، چلانے اور واویلا کرنے اور کتوں کے بھونکنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ فائر کی دو مزید آوازوں نے لوگوں کے غل غپاڑے اور کتوں کے بھونکنے کی آواز بند کر دی۔ پھر حکم چند نے لڑکی کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ نشے کی شدت میں وہ گولیوں کو پٹاخے خیال کرتا رہا اور نشے کی ترنگ میں وہ یہ بھی بھول گیا کہ اس کی گرفت میں ملفوف لڑکی کی چھاتیاں تو بریسیئر میں پوری بھی نہیں

آئیں اور پھر اس نے لال ٹین کی بتی بہت نیچی کر دی۔ لال ٹین بھڑک کر گل ہو گئی — لڑکی نے ایک عالم بے بسی میں اپنا منہ اپنی ڈھیلی ڈھالی ساڑی کے پلو سے ڈھانپ لیا۔

ڈکیتی کی واردات کے اگلے روز صبح کے وقت اسٹیشن پر کچھ ضرورت سے زیادہ بھیڑ تھی۔ منو ماجرا کے کئی باشندوں کی عادت تھی کہ وہ ساڑھے دس بجے والی گاڑی دیکھنے آیا کرتے تھے۔ انھیں منو ماجرا اسٹیشن سے سوار ہو کر جانے والے مسافروں کو دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ گاڑی کے تاخیر سے آنے کے بارے میں بحث کرنے کے بہت زیادہ شوقین تھے۔ ملک کی تقسیم نے اس شوق کو اور بھی دوبالا کر دیا تھا۔ اب گاڑیاں چار چار، پانچ پانچ اور بسا اوقات بیس بیس گھنٹے کی تاخیر سے آ رہی تھیں۔ پاکستان سے آنے والی گاڑیاں ہندو شرنارتھیوں سے اور ادھر سے جانے والی مسلمان مہاجرین سے لدی ہوتیں۔ ڈبوں کے جوڑوں، گاڑی کی چھتوں اور دروازوں پر مسافر بھرے، جمے اور لٹکے دکھائی دیتے۔

لیکن اس روز مسافر گاڑی صرف ایک گھنٹہ لیٹ تھی — جیسا کہ جنگ سے پہلے ہوا کرتی تھی۔ اس کے پلیٹ فارم پر پہنچتے ہی چنے بھٹے اور گول گپے بیچنے والوں کی آوازیں یوں آنے لگیں جیسے بہت سارے مسافروں کے اترنے کی توقع ہو جب گارڈ نے روانگی کی سیٹی بجائی تو سبھی مسافر دوبارہ ریل میں سوار ہو گئے۔ پلیٹ فارم پر صرف ایک سکھ جاٹ اور اس کی دلہن رہ گئے جس کی گود میں ایک بچہ بھی تھا۔ جاٹ نے اپنے بستر والی بقچی جھٹکا دے کر سر پر رکھی اور اس پر سہارے کی خاطر ایک ہاتھ اٹھا لیا۔ دوسرے ہاتھ میں اس نے دیسی گھی کا کنستر تھام لیا۔ پیتل کی پتریاں منڈھی بانس کی لاٹھی اس نے بغل میں دابی جس کا زیریں سرا زمین پر گھسٹتا تھا۔ دونوں ٹکٹ اس نے دانتوں میں داب کر اپنے ہونٹوں کو قدرے کشادہ کر لیا۔ اس کی دلہن نے لوہے کے جنگلے کے پیچھے کھڑے کچھ دیہاتیوں کو دیکھ کر بڑی عجلت سے گھونگھٹ نکال لیا۔ وہ اپنے شوہر کے عقب میں قدم قدم چلی تو اس کے پاؤں کے

سلیپر کھٹ کھٹ کی آواز دینے لگے اور پائیں کھنکنے لگیں۔ اسٹیشن ماسٹر نے جاٹ کے ہاتھوں کے بیچ سے ٹکٹ اُچک لیے اور اس جوڑے کو باہر کا راستہ دکھا دیا۔ باہر کھڑے دیہاتیوں نے ان کا معانقوں اور مبارکبادوں سے پر زور خیر مقدم کیا۔

جب گارڈ نے دوسری سیٹی بجا کر سبز جھنڈی لہرائی تو انجن کے پچھلے ڈبے میں سے مسلح پولیس اتر پڑی۔ ایک چھوٹا تھانیدار تھا اور درجن بھر سپاہی' ان کے کندھوں پر رائفلیں تھیں اور گلے میں کارتوسوں سے بھری پیٹیاں تھیں۔ دو سپاہیوں کے ہاتھوں میں بیڑیاں اور ہتھکڑیاں تھیں۔ گاؤں والوں نے دیکھا کہ اسٹیشن ماسٹر نے پولیس کے لیے پچھلا دروازہ چوپٹ کھول دیا ہے اور تھانیدار کو نہایت احترام سے نمسکار پیش کیا ہے۔

جب پولیس گاؤں کے نزدیک پہنچی تو چوپال کے پیپل کے نیچے بچھے تخت پوش پر بیٹھے دس پندرہ افراد پولیس کے خیر مقدم کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے' یہ سب پولیس کے ساتھ ساتھ رام لال کے گھر کی جانب چل دیے تھے۔ پولیس رام لال کے قتل اور ڈکیتی کی تفتیش کے لیے آئی تھی۔

تھانے دار نے رام لال کی لاش دو سپاہیوں کو سونپ دی اور ان کے ذمے ڈیوٹی لگائی کہ وہ لاش کو ایک بیل گاڑی میں رکھوا کر تھانہ چندن نگر لے جائیں جہاں لاش کا پوسٹ مارٹم کیا جانا تھا۔

اس کے بعد تھانے دار نے جگے کے بارے میں پوچھا' جگے کے ایک ہمسائے نے تھانیدار کے کان میں کچھ پھونکا۔ اس نے باقی سپاہی اپنے ساتھ لیے جگے کے گھر کو گھیر لیا۔ کچھ بندوق بردار سپاہی ہمسایوں کی چھت پر چڑھ گئے اور کچھ جگے کے گھر کے ارد گرد پھیل گئے۔ چار یا پانچ پستول بردار سپاہی اس کے آنگن میں جا گھسے' جگا ایک میلی سی چادر تانے اپنی چارپائی پر پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ اور غل غپاڑہ بند ہونے کے بعد فسح ہوتے گھر آیا تھا۔ اس کی ماں بیرونی کھٹکا بند کر کے باہر گئی ہوئی تھی۔

پولیس نے خوابیدہ جگّے کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں اور دائیں ہاتھ کو ہتھکڑی لگا دی۔ پستول برداروں نے اپنی پستولیں ہولسٹروں میں ڈال لیں اور بندوق بردار صحن میں داخل ہوئے۔ بندوق برداروں نے جگّے کو بندوق کے دستے مار مار کر جگایا۔ "ارے جگّے اٹھ اوئے، دوپہر ڈھل گئی" ایک نے کہا۔

"دیکھو کس طرح سوتا ہے، سؤر کی طرح، جیسے دین دنیا کا کوئی فکر فاقہ نہ ہو اسے" دوسرے سپاہی نے سب کو سنا کر کہا۔

تھکن اور بے نیندی کا مارا ہوا جگّا آنکھیں ملتا ہوا بیٹھ گیا۔ اس نے بیڑیوں اور ہتھکڑیوں کی طرف ایک تجاہلِ عارفانہ سے دیکھا اور باہیں تان کر ایک طویل انگڑائی لی۔ اسے پھر نیند آ گئی۔ اور وہ اونگھنے لگا۔

اتنے میں جگّے کی ماں بھی گھر آ گئی۔ اس نے اپنے آنگن کو پولیس والوں سے پُر دیکھا، اس کا بیٹا چارپائی پر اپنے سر کو ہتھکڑی والے ہاتھ سے تھامے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ماں نے دوڑ کر اپنے بیٹے کے گھٹنوں کو گرفت میں لے لیا اور اپنا سر اس کی رانوں پر رکھ کر پھٹ پڑی اور زار زار رونے لگی۔

جب جگّے کو ہوش آیا تو اس نے دھکا دے کر اپنی ماں کو ایک طرف ہٹا دیا، "تم روتی کیوں ہو بھلا" وہ بولا "تم اچھی طرح جانتی ہو، میرا اس ڈاکے میں کوئی ہاتھ نہیں۔"

وہ اور بھی اونچی آواز سے رونے لگی "یہ نہیں تھا، اس نے کچھ نہیں کیا، واسطہ خدا کا، اس نے کچھ نہیں کیا۔"

"تو کہاں تھا یہ قتل والی رات؟" تھانیدار نے پوچھا۔

"یہ تو اپنے کھیتوں میں تھا۔ میں قسم دے سکتی ہوں کہ یہ ڈاکوؤں کے ساتھ نہیں تھا۔"

"یہ بدمعاش ہے، دس نمبری ہے اور غروب کے بعد اس کو گھر سے باہر نکلنا منع ہے۔ اس کی گرفتاری لازمی ہے۔" اور پھر تھانیدار نے سپاہیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"کمروں اور چھتوں کی تلاشی لو۔" تھانیدار کو پورا شک تھا کہ ڈکیتی میں جگّے کا ہاتھ ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ڈاکے میں جگّے کا ہاتھ نہ ہو۔

چار سپاہی جگّے کے گھر کی تلاشی لینے لگے۔ انھوں نے لوہے کے ٹرنک اور ٹین کے ڈبّے خالی کرنے شروع کر دیے۔ باہر سوکھے چارے کے ڈھیر میں سے جگّے کا برچھا برآمد ہو چکا تھا۔

"یہ تمھارے باپ نے رکھا ہے یہاں" تھانیدار جگّے کی ماں کو مخاطب کر کے گرجا اور پھر اس نے ایک سپاہی کو حکم دیا "اس کے بلیڈ پر کپڑا لپیٹ دو، ہو سکتا ہے اس پر خون کے نشانات ہوں"۔

"نہیں، اس پر کچھ نہیں" ماں نے چیخ کر کہا "کچھ نہیں، یہ تو اس نے کھیتوں سے جنگلی سؤروں کے مارنے کے لیے رکھا ہوا ہے، مہاراج کی سوگند، اس میں جگّے کا کوئی ہاتھ نہیں"۔

"ہم دیکھیں گے، ہم سمجھیں گے، یہ ہمارا کام ہے" تھانیدار بولا، "تم اپنے پاس ہی رکھو اس کی بے گناہی کے ثبوت کو"۔

جگّے کی عمر رسیدہ ماں نے اپنے آنسو تھام لیے۔ ثبوت اس کے پاس تھا، ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کی پوٹلی جسے وہ تھانے میں دکھا کر جگّے کو چھڑوا سکتی تھی۔ چوڑیوں کے بارے میں اس نے جگّے کو کچھ نہیں بتایا تھا اگر اسے علم ہو جاتا تو وہ ڈاکوؤں کی یہ زیادتی برداشت نہ کر پاتا۔ اس نے غصّے میں آگ ببھوکا ہو کر کسی نہ کسی کا جسم پھونک دینا تھا، لیکن اب وہ بیڑیوں میں بند تھا ــــــ بگڑ ہی سکتا تھا بگاڑ نہیں سکتا تھا۔

ذرا ٹھہرنا بھائی، پولیس والے! میرے پاس ثبوت ہے" جگّے کی ماں نے کہا اور اندر لوہے کے ٹرنک کے ایک گوشے میں سے ایک پوٹلی نکال لائی۔ اس پوٹلی پر سے خاکی کاغذ اُدھیڑا، اس میں نیلی، لال اور سنہری چوڑیوں کے ٹکڑے تھے۔ ان میں سے صرف دو ثابت بچی تھیں۔ یہ حولدار نے سنبھال لیں۔

"کس کا ثبوت ہیں یہ چوڑیاں؟"

"یہ ڈاکوؤں نے قتل کے بعد ادھر سے گزرتے ہوئے ہمارے آنگن میں پھینکی تھیں۔ جگّے نے ان کا ساتھ دینے سے انکار کیا تھا اس لیے وہ اسے چوڑیاں پیش کر کے اس کی

بے عزت کرنا چاہتے تھے، دیکھو" اس نے اپنی عمر رسیدہ بانہہ دکھا کر کہا" میں بڑھیا نے تھوڑا پہنی تھیں یہ، میری تو کلائی میں بھی نہیں آتیں۔"

"تو جگے کو ڈاکوؤں کا پتہ ہے، کیا کہہ کر پھینکی تھیں انھوں نے چوڑیاں؟"

"کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں، وہ جگے کو گالیاں دیتے تھے۔ ۔ ۔ ۔"

"تم اپنا منہ بند نہیں رکھ سکتیں" جگے نے غصے میں آکر ماں کو جھڑکا" میں نہیں جانتا کہ ڈاکو کون تھے، میں تو یہی جانتا ہوں کہ میں ان کے ساتھ نہیں تھا۔"

"تو کس نے پھینکی ہیں تمھارے لیے چوڑیاں" سپاہی نے ٹوٹی ہوئی چوڑیاں جگے کو دکھا کر کہا۔

جگے کو غصہ آگیا۔ اس نے ہتھکڑیوں سمیت اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لیں اور حوالدار کے ہاتھوں میں تھمی چوڑیوں پر مار کر بولا" کون اپنی ماں کا یار پھینک گیا ہے میرے گھر میں چوڑیاں؟ کون ۔ ۔ ۔ ۔"

سارے سپاہی اکٹھے ہو کر جگے کو جوتیوں، تھپڑوں اور مکوں سے زدوکوب کرنے لگے۔ جگے نے اپنا سر اپنی بانہوں کے بیچ لے لیا اور سرینوں کو زمین پر ٹکا کر بیٹھ گیا۔ اس کی ماں دوبارہ اپنے سر پر دو ہتڑ مار کر پیٹنے لگی۔ وہ پولیس کے حلقے میں سے گزر کر اپنے بیٹے کے اوپر گر گئی۔

"نہ مارو، نہ مارو اسے، خدا تمھاری حفاظت سے ہاتھ نہ کھینچے، یہ بے قصور ہے، یہ سب میرا قصور ہے، تم مجھے مار ڈالو۔"

سپاہیوں نے جگے کو مارنا بند کر دیا حوالدار نے اپنی ہتھیلیوں میں سے چوڑیوں کے ٹکڑے نکالے اور ہتھیلیوں کا لہو باہر گرا کر رومال سے ہتھیلیاں پونچھ ڈالیں۔

"تم رکھو اپنے لاڈلے کا ثبوت اپنے پاس" اس نے جگے کی ماں سے کہا" ہم اگلوا لیں گے سب کچھ اس کتیا کے بچے سے، سب کچھ صاف صاف بتا دے گا یہ تو جب اس کے چوتڑوں پر بید مجنوں نے اپنی گت شروع کی" تب اس نے سپاہیوں کو حکم دیا" لے چلو اسے باہر۔"

ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑے ہوئے جگے کو گھر سے باہر لے آیا گیا۔ اس نے رخصت ہوتے وقت اپنی سینہ کوبی کرتی ماں سے کسی محبت کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے آخری الفاظ کچھ یوں تھے۔

"میں جلدی لوٹوں گا، یہ مجھے بر چھار رکھنے اور بے وقت باہر نکلنے پر کچھ مہینوں سے زیادہ نہیں رکھ سکتے" ست سری اکال"

جگے کو جتنی جلدی غصہ آیا تھا، اتنی ہی جلدی سرد پڑ گیا، اسے دہلیز سے باہر نکلتے ہی اپنی مار پیٹ اور چوڑیوں کی کہانی بھول گئی۔ اس کو پولیس والوں پر کوئی غصہ نہیں تھا۔ وہ کوئی عام لوگوں جیسے لوگ نہیں تھے۔ وہ نہ کسی کے دوست تھے اور نہ کسی کے دشمن، وہ تو وردی پوش لوگ تھے اور وردیوں کی حفاظت کے لیے ہی سب کچھ کرتے تھے۔

جگے کو گاؤں والوں سے منہ چھپانے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ سارا گاؤں اسے جانتا تھا وہ مسکراتا اور سب کو ست سری اکال کہتا جا رہا تھا۔ پاؤں میں پڑی بیڑیوں کے سبب وہ اپنی ٹانگیں قدرے پھیلا کر دھیرے دھیرے چل رہا تھا۔ اس کی چال میں بڑی لاپروائی اور بے فکری تھی۔ اس کی یہ لاپروائی اپنی چھوٹی بھوری مونچھوں کو تاؤ دینے اور پولیس والوں سے گھٹیا جملے بازی کے تبادلے پر مستزاد تھی۔

کنارِ آب اس کے برابر حوالدار اور دو سپاہی تھے، حوالدار اس کارواں کا رہنما تھا۔ باقی لوگ جگے کے آگے اور پیچھے تھے جگے کے شانے اور سر پولیس والوں کی پگڑیوں سے بھی نکلتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ یوں جیسے بھیڑوں کے گلے میں اونٹ ہو، اونچا، لمبا، چوڑا چکلا اور دیوانہ بکار خویش ہوشیار قسم کا جاٹ۔ بیڑیوں کا سرگم چھیڑتا چلا جا رہا تھا۔ کسی کو بھی بات چیت کرنے کی خواہش نہیں تھی، سپاہی بھی ایک گو مگو کشش و پیچ کے عالم میں تھے۔ وہ جانتے تھے کہ انھوں نے غلطی کی ہے۔ یہ درست ہے کہ جگے نے بے وقت باہر نکل کر قانون کی خلاف ورزی کی ہے لیکن اس کا ڈکیتی کی واردات میں شمولیت کا کوئی ثبوت موجود نہیں تھا وہ تو اس رات گاؤں میں ہی نہیں تھا شاید اسی

لیے جگا تشویش میں مبتلا نہیں تھا۔ گرفتاری یوں بھی اس کے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔ اس نے اپنی نصف زندگی گھر کے اندر اور نصف پسِ دیوارِ زنداں گزاری تھی۔ پولیس سے اُس کا ربط وضبط موروثی تھا۔ اس کے باپ عالم سنگھ کو بھی اپنی زندگی میں پولیس سے دس نمبر کا تمغہ ملا تھا اسے قتل اور ڈکیتی کے ایک مقدمے میں پھانسی کی سزا ہوئی اور اسے تختۂ دار پر کھینچ دیا گیا تھا۔ جگے کی ماں کو وکیل کی فیس ادا کرنے کے لیے پوری زمین گروی رکھنی پڑ گئی تھی زمین چھڑانے کے لیے جگے کو رقم کی ضرورت تھی جو اس نے ایک سال کے اندر اندر پیدا کر لی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ کس طرح۔ بس ایک سال بعد پولیس ہی کو کچھ اندازہ ہو سکا تھا، اور اس وقت پولیس اسے دس نمبر کا ایوارڈ دینے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھی جگے کی عدم موجودگی میں سب اسے دس نمبریا کہہ کر یاد کرتے تھے۔ بدمعاشی اس کے مقدر کا نوشتہ تھی، وہ بھی نچلا نہ بیٹھ پایا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں کوئی نہ کوئی گل کھلانے کی خواہش بیدار رہتی تھی۔ بوائی اور کٹائی کے دنوں میں وہ اس خواہش کو دبا لیا کرتا لیکن فراغت کے اوقات میں اس کے باطن کا شیطان پھر بیدار ہو جاتا تھا اور پھر اس سے کچھ نہ کچھ سرزد ہو جاتا تھا۔ کوئی گناہ،

دھیرے دھیرے سبھی پُل کے نیچے سے گزرتے ڈاک بنگلے کے نواح میں پہنچ گئے۔ جب سپاہی جگے کو لے کر اندر داخل ہوئے تو تھانیدار نے فرمان جاری کیا کہ اسے ملازمین کی اقامت گاہوں میں لے جایا جائے۔ مجسٹریٹ حکم چند جی اس وقت لباس تبدیل کر کے تیار ہو رہے تھے۔ تھانیدار جگے کو سپاہیوں کے سپرد کرنے کے بعد بنگلے کی سمت مراجعت کر گیا اور اس نے اندر جا کر مجسٹریٹ کو جگے کی گرفتاری کی خبر سنائی۔ مجسٹریٹ صاحب نے انھیں ہدایات کیں کہ وہ جگے کے گھر سے چوڑیاں برآمد ہونے کا الزام لگا کر اس کی گرفتاری کا اندراج کریں اور پھر اسے مار پیٹ کر ڈاکوؤں کے نام معلوم کرنے کی کوشش کریں حکم چند مجسٹریٹ کے حکم کی تعمیل کے بعد تھانہ چندر نگر لے جانے کے لیے تانگے میں بٹھا لیا گیا۔ جگا پچھلی نشست پر دو سپاہیوں کے درمیان جکڑا ہوا تھا، اگرچہ کچی سڑک کا سفر بہت تھکا دینے والا تھا لیکن جگا اور سپاہی اس کے عادی ہو چکے تھے۔ یہ کچی سڑک ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ جاری تھی۔

"آج کل تو تھانے میں بہت سے ملزم ہوں گے" جگے نے بات چھیڑی۔

"کہاں! ایک بھی نہیں" سپاہی نے جواب دیا۔ "ہم فساد پھیلانے والوں کو پکڑتے ہی نہیں اور کسی دوسرے جرم کی تفتیش کا موقع ہی نہیں ملتا۔ پچھلے سات دنوں میں آج پہلے دن ایک تمھاری گرفتاری ہوئی ہے۔ دونوں حوالاتیں خالی ہیں، ایک تمھیں الاٹ ہو جائے گی پوری کی پوری۔"

اور پھر سب فسادات کا تذکرہ کرنے لگے جگے نے بتایا کہ کس طرح پاکستان کو جانے والے ٹرکوں کے سپاہی، سربراہ جاتے۔ اکیلے دکیلے سکھ یا ہندو کو دیکھتے ہیں تو ٹرک کی رفتار دھیمی کر کے اسے گولی سے اڑا دیتے ہیں۔ "تم لوگوں کو اور بتاؤں" جگے نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا "ایک خارش زدہ کتا سڑک عبور کر رہا تھا، اس کتے کو دیکھ کر ٹرک والے نے، جو نہ جانے کتنی ہی غیر مسلم اموات کا ذمہ دار تھا ٹرک کو نیچے اتار لیا تاکہ وہ کتا بچ جائے۔ وہ خارش زدہ آوارہ کتا تھا۔ ٹرک شیشم کے ایک پیڑ سے ٹکرایا، ڈرائیور اور دو سپاہی لقمۂ اجل ہو گئے اور باقی سب کے سب بری طرح زخمی ہوئے۔ کہاں بھول بھلیوں میں گم ہو جا راج، کتوں کی قدر ہے لیکن انسانوں کی نہیں۔"

جگے کی بات سن کر تانگہ بان بھولے نے اپنے گھوڑے پر بلا وجہ چابک برسانے شروع کر دیے۔

جگے نے اس طرف دیکھ کر کہا "تمھیں خدا کا خوف نہیں بھولے! بے قصور جانور کو اندھا دھند پیٹے چلے جاتے ہو؟"

بھولے نے اپنے گھوڑے کی پٹائی سے تو ہاتھ کھینچ لیا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات بہت کچھ کہہ رہے تھے، گھوڑا اس کی ملکیت تھا، وہ اس سے جو سلوک چاہتا کرتا، جگا کون ہے ٹوکنے والا؟

"آج کل کام دھندا کیسا چل رہا ہے، بھولے!" جگا نے بھولے کو منانے کے جذبے سے کہا۔

"شکر ہے نیلی چھتری والے کا" بھولے نے آسمان کی طرف اپنی چابک کو اشارۃً لہرا کر

کہا' اور پھر اس نے یکایک بات کو ایک نیا موڑ دیتے ہوئے کہا "تھانیدار صاحب بھول آدمی ہیں۔ ان کے سہارے دن کاٹ رہے ہیں۔"

"اچھا بھولے' چھوڑو' ان باتوں کو' اور یہ بتاؤ کہ کوئی مسلمان زادی ہاتھ نہیں لگتی تمہارے۔ آج کل تو خاندان سے الگ کرکے زبردستی لائی گئی لڑکیاں بہت سستے داموں پہ مل رہی ہیں۔"

"کیوں رے سردار! اگر تمہیں ایک مسلمان زادی مفت میں ہاتھ آگئی ہے تو میں کوئی نامرد ہوں گھر سے زبردستی اٹھوائی ہوئی لڑکیوں پر ہاتھ رکھتا پھروں" کہنے کو بھولا تانگہ بان یہ بات منہ سے نکال بیٹھا لیکن جب اس نے غصے سے تمتماتے جگے کے چہرے کو دیکھا تو خوف سے اس کا پیشاب خطا ہو گیا۔

"حرامزادہ" جگے نے جوش میں آکر کہا اور پھر وہ نوراں کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسے یہ پتہ نہیں چل پا رہا تھا کہ نوراں سے اس کے عشق کی چرچا اتنی پھیل گئی ہے کہ چندر نگر کا یہ تانگے بان بھی اس کی بو پا گیا ہے۔

خود ہی اپنی سوچوں میں گم' سبھی چندر نگر پہنچ گئے۔

تانگہ تھانے کے داخلی دروازے کے پاس جا کر رک گیا۔ تھانے کے بڑے دروازے پر اردو رسم الخط میں "خوش آمدید" لکھا ہوا تھا۔ اس دروازے میں سے گزر کر جگے کو سیدھا تفتیشی کمرے میں لے جایا گیا۔ میز کے بالکل اوپر کنگ جارج ششم کی تصویر فریم میں جڑی ہوئی رکھی تھی جس پر اردو میں لکھ کر لگایا گیا تھا "رشوت لینا جرم ہے" ایک دیوار پر کسی کیلنڈر سے قطع کرکے مہاتما گاندھی کی تصویر لگائی گئی تھی۔ اس کے نیچے انگریزی میں لکھا تھا

HONESTY IS THE BEST POLICY

("ایمانداری سب سے اعلیٰ اصول ہے")

دوسری دیواروں پر ساری تصویریں بدمعاشوں' ٹھگوں' دس نمبروں اور گھروں سے بھاگے ہوئے لڑکوں کی تھیں۔ حوالدار نے ایک بہت بڑا رجسٹر کھول کر دن بھر کے واقعات روزنامچے میں درج کر دیے۔

اس کے بعد جگے کو صحن کے راستے حوالاتوں کی طرف لے جایا گیا۔ صحن کے ایک سمت کو قیدیوں کے لیے بنائی گئی یہ دو حوالاتیں تھیں اور دوسری سمت میں سپاہیوں کی بیرکیں۔ اور بالکل سامنے کی دیوار عشق پیچاں کی بیل سے ڈھکی ہوئی تھی۔ جگے کے وہاں پہنچتے ہی ایک نے اس پر آواز کسنے شروع کر دیے تھے۔ "اوئے پھر آ گئے ہو جگے، تم نے تھانے کو اپنی سسرال سمجھ رکھا ہے" ایک سپاہی نے اپنی بیرک میں سے آواز لگائی۔

"آپ لوگوں کا بھی داماد کے بغیر جی نہیں لگتا، حوالدار" جگے نے دیہاتی بدمعاشوں کے لہجے میں باآواز بلند جواب دیا۔ اب تک وہ تانگے میں بیتے ناخوشگوار لمحات کو فراموش کر بیٹھا تھا۔

حوالات میں پہنچے بمشکل پندرہ منٹ ہوئے ہوں گے کہ جگے کے خراٹوں کی آواز گونجنے لگی، وہ رات بھر نہیں سویا تھا۔

جب تک تھانیدار نے آکر اسے بیدار نہیں کر لیا، جگا شام تک بڑی بے فکری کی نیند سوتا رہا۔

"ست سری اکال تھانیدار جی!" جگے نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

تھانیدار نے جگے کے "ست سری اکال" کو سنا ان سنا کر دیا۔

"تم کبھی بدمعاشی چھوڑو گے بھی یا نہیں، جگے!"

"سوہنیاں والیو! جو جی میں آئے کہو، لیکن اس بار میرا کوئی قصور نہیں میں بالکل بے گناہ ہوں۔"

"کہاں تھے تم ڈکیتی والی رات؟"

"میرا ڈکیتی میں کوئی ہاتھ نہیں۔"

"میں پوچھتا ہوں، تم تھے کہاں اس رات؟"

"میں کھیتوں پر تھا، سوروں سے فصل بچانے کے لیے۔"

"تم نمبردار کو اطلاع دے کر کیوں نہیں گئے؟ ـــــ اچھا جلدی جلدی بتاؤ

ڈاکو کون تھے؟"

"حضور! میں کیا جانوں ڈاکو کون تھے، میں تو گاؤں میں نہیں تھا، ورنہ کسی ماں دم تھا کہ منوماجرا میں قتل اور ڈکیتی کی واردات کرے۔"

"میں نہیں جانتا کہ تم کہاں تھے اور کہاں نہیں تھے۔ ڈاکو تمہارے شناسا ہیں۔ وہ تمہارے لیے چوڑیاں پھینک کے گئے ہیں تمہارے گھر میں۔"

جگّا فرش پر خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"تم ڈنڈے کے بغیر نہیں بولو گے بدمعاش" تھانے دار نے اپنے ہاتھ میں تھاما ہوا ہنٹر گھماتے ہوئے کہا۔

"نہیں تھانے دار صاحب نہیں! خدا کے لیے مجھے کوئی علم نہیں۔" جگّے نے دیوار کے ساتھ جھک کر کھڑے ہوئے تھانیدار سے کہا۔ جگّے کو اس طرح سے جھکتے ہوئے خجالت محسوس ہو رہی تھی لیکن اسے پولیس کی پہلی پٹائی ابھی فراموش نہیں ہو پائی تھی۔ وہ سب کچھ یاد کر کے تھرا گیا۔ کیا نہیں کرتے یہ پولیس والے، سب کچھ اگلوا لیتے تھے۔

سوا چھ فٹ قامت کے جوان کو پاؤں میں گرا دیکھ کر تھانیدار پر خمار سا چھا گیا لیکن پھر بھی اسے جگّے کے لیے کوئی رحم محسوس نہیں ہوا۔

"تمہیں دو دن کی مہلت دی جاتی ہے، ڈاکوؤں کی نشان دہی کے لیے۔ اگر نہیں بتاؤ گے تو مار مار کر وہ حشر کروں گا کہ تا عمر یاد رہے گا" یہ کہہ کر جگّے کے ہاتھوں سے اپنے پاؤں چھڑا کر تھانیدار چلا گیا۔

ستمبر کے شروع میں منوماجرا کی ہر چیز اتھل پتھل ہو کر رہ گئی تھی۔ ریلوں کے مقررہ اوقات کا تصور ہی ناپید ہو گیا تھا۔ کئی گاڑیاں راتوں رات رُکے بغیر نکل جاتیں۔ کچھ دن تک تو یوں محسوس ہوتا رہا کہ ریلوے بابوؤں نے اپنے ٹائم پیسوں کے الارم غلط لگا دیے تھے اور کچھ دنوں تک ایسی صورتِ حال بھی رہی کہ جیسے سبھی ریلوے ملازمین اپنی گھڑیوں کو چابی دینا تک

بھول گئے ہوں۔ ملا امام بخش، بھائی ست سنگھ کے اُپدیشوں کے انتظار میں رہتا اور بھائی ست سنگھ ملا کی اذان کی ٹوہ میں۔ وقت کی رفتار سے بے خبر اہلِ منوماجرا بستر میں پڑے ڈاک گاڑی کا انتظار کرتے لیکن گاڑی نہ آتی گاڑیوں کے شور و غل کے بغیر بچوں کو یہ پتہ نہ چلتا کہ کون سا وقت بھوک لگنے کا ہے اور کون سا وقت ماں باپ سے روٹی مانگنے کا۔ شام کے وقت سبھی اہلِ منوماجرا جھٹپٹے سے پہلے گھروں میں آجاتے اور رات والی میل کے آنے سے پہلے بستروں میں پناہ گزیں ہو جاتے۔ مال گاڑیوں کی آمدورفت سرے سے بند ہوگئی تھی۔ اہلِ منوماجرا کو لوری گا کر سلانے والی کوئی گاڑی نہ رہی۔ کئی گاڑیاں آتی ہی نہیں تھیں اور کئی رات کے ہنگام بغیر کسی مقررہ وقت کے علی الصبح کھٹ کھٹاک کی آواز کے ساتھ منوماجرا کی نیندوں کے سپنے چور چور کر کے اِدھر اُدھر بکھیر دیتیں۔

وہاں روزمرہ کی زندگی میں صرف یہی ایک تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی بلکہ سکھ سپاہیوں کے ایک دستے نے اسٹیشن کے نواح میں آکر اپنے راؤٹی خیمے نصب کر لیے تھے۔ انھوں نے پُل سے قریب پڑنے والے سگنل کے نیچے ریت کی بوریاں چن کر ایک چھ فٹ بلند مچان سی تعمیر کرائی تھی۔ اور اس پر چاروں جانب مشین گنیں نصب کر لی تھیں۔ مسلح سنتری پلیٹ فارم پر پہرا دیتے رہتے اور کسی دیہاتی کو ریل کی پٹری کے قریب جانے کی اجازت نہ دیتے۔ دہلی سے آنے والی ساری گاڑیاں یہاں رُکتیں اور پاکستان جانے سے پہلے اپنے ڈرائیور اور گارڈ تبدیل کر لیتیں۔

اور پھر ایک دن پاکستان سے آنے والی ایک گاڑی منوماجرا کے اسٹیشن پر رکی، پہلی نظر میں اس گاڑی سے ان کے دنوں میں چلنے والی عام گاڑی کا تاثر مرتب ہوا۔ چھت پر کوئی نہیں تھا۔ ڈبوں کے درمیانی فاصلوں سے چمٹا ہوا کوئی شخص دکھائی نہ دیا۔ ریل کے دروازوں کے ساتھ بھی کوئی معلق نہ تھا لیکن پھر بھی اس گاڑی کی صورت معمول کے مطابق نہیں تھی۔ اس سے خوف سا مترشح تھا۔ یہ دل کو بے چینی کے سگنل دے رہی تھی، جونہی یہ پلیٹ فارم پر آکر رکی تو اس کے پچھلے ڈبے میں سے ایک گارڈ چھلانگ مار کر اُترا اور دوڑتا ہوا اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ اس کے بعد دونوں نے نصب شدہ

خیموں کی طرف گئے اور ان کے انچارج سے ملاقات کی۔ اس نے سپاہیوں کو بلا کر حکم دیا کہ وہ گاؤں کے کسی آدمی کو گاڑی کے قریب نہ آنے دیں اور انھیں واپس بھیج دیں۔ ایک آدمی موٹر سائیکل پر چندر نگر کی جانب بھجوا دیا گیا۔ ایک گھنٹے بعد چندر نگر کا تھانیدار اپنے ہمراہ پچاس کے قریب ہتھیار بند سپاہی لے کر اسٹیشن پر آوارد ہوا۔ ان کے پیچھے پیچھے ڈپٹی حکم چند بھی اپنی امریکی کار میں بیٹھ کر آ پہنچا۔

سہ پہر اس وحشت انگیز گاڑی کے آجانے سے منو ماجرا میں ہلچل سی مچ گئی۔ لوگ اپنی اپنی چھتوں پر چڑھ کر اسٹیشن کی طرف دیکھنے لگے۔ انھیں پلیٹ فارم کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک ریل گاڑی کی سیاہ چھت کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسٹیشن اور اس کی آہنی باڑ کی اوٹ میں ریل کا باقی حصہ پنہاں تھا۔ کبھی کبھی کسی سپاہی کا خاکی ہیولیٰ اسٹیشن سے باہر نکلتا اور پھر واپس چلا جاتا۔

اسی شام اس گاؤں کے باشندے جگہ جگہ جمع ہو کر اس گاڑی کے تذکرے کرنے لگے، تب انھوں نے پیپل کے نیچے اکٹھے ہو کر ایک منصوبہ بنایا اور سبھی مل کر گوردوارے کی سمت چل پڑے۔ عورتیں جو ہر گھر کے دروازے پر جا کر اس گاڑی کے بارے میں معلومات جمع کر رہی تھیں یا مہیا کرتی جاتی تھیں نمبردار کے گھر جمع ہو کر اپنے مردوں کا انتظار کرنے لگیں۔ وہ گاڑی کے متعلق مکمل معلومات حاصل کرنا چاہتی تھیں۔

منو ماجرا کے باشندے ہر نئے سانحے کے ظہور پذیر ہونے کے ہنگام پر جمع ہو جایا کرتے ــــ عورتیں نمبردار کے گھر میں اور مرد گوردوارے میں۔ گاؤں کا کوئی باضابطہ معتبر قائد نہیں تھا بلکہ اس کا سرپنچ بنیا سنگھ صرف لگان اکٹھا کرنے والا نمبردار تھا۔ اس کی نمبرداری موروثی طور پر پشت ہا پشت سے چلی آرہی تھی۔ اس کے پاس دوسروں سے زیادہ زمین بھی نہیں تھی۔ اس میں کوئی ایسی اضافی خوبی بھی نہیں تھی۔ جس کی بنا پر اسے قائد تسلیم کیا جا سکتا۔ اسے کسی نوعیت کا گھمنڈ بھی نہیں تھا۔ وہ ایک ایماندار اور محنت کش انسان تھا۔ گاؤں کے دوسرے جاٹ بھائیوں جیسا ــــ لیکن سرکاری اہل کار اور پولیس چونکہ اسی سے معاملہ کرتی تھی اسی لیے اس کی بڑائی قائم تھی۔ کوئی اسے نام لے کر نہیں بلاتا تھا۔ وہ اپنے باپ کے باپ اور

اُس کے بھی باپ کی طرح سب کے لیے "اوے نمبردار" ہی تھا۔ اس کے قریبی دوست اسے "نمبرا" کہہ کر بھی پکارتے تھے۔

گاؤں کی پنچایت میں اگر کسی کی شنوائی ہوتی تو صرف مسجد کے ملا امام بخش کی اور گوردوارے کے بھائی ست سنگھ کی۔ امام بخش جولاہا تھا اور پنجاب میں جولاہے پورے گاؤں کے تمسخر کا بوجھ اٹھایا کرتے ہیں۔ یہ لوگ بزدل اور زنخے سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن امام بخش کی عمر اور پاکیزگیٔ کردار نے اسے "عزت دار" بنا دیا تھا۔ اس کے گھر میں ہونے والے سانحات نے اسے قابلِ رحم اور ہمدردی کا مستحق کردار بنا دیا تھا۔ پنجابی انہی سے محبت کرتے ہیں جن پر وہ رحم کر سکتے ہوں۔ اس کی بیوی اور اکلوتا بیٹا دو تین دن کے وقفے میں اوپر تلے راہیِ ملکِ عدم ہوئے تھے۔ اس کی نظر جو پہلے ہی قدرے کمزور تھی بالکل ہی جاتی رہی تھی۔ وہ ہینڈلوم پر کام کرنے کے قابل بھی نہ رہا تھا اسے مانگ تانگ کر گزر بسر کرنا پڑتی تھی۔ اور اس کی باقیماندہ واحد اولاد نوراں اس بڑھاپے میں اس کی خدمت کرتی تھی۔ اس نے مسجد میں رہ کر مسلمان زادوں کو ناظرہ قرآن کی تعلیم دینا شروع کر دی تھی۔ وہ قرآنی آیات لکھ کر گاؤں والوں کو تعویذ بنا کر دیا کرتا تھا۔ بیماروں کے لیے دوائی کی پڑیا کی طرح۔ رنگل سیلنے کے لیے وہ اور اس کی بیٹی خیرات میں آئے آٹے، سبزیوں اور پھٹے پرانے کپڑوں پر گزر بسر کرتے تھے۔ اسے بہت عمدہ چٹکلے اور کہانیاں یاد تھیں جنھیں سن کر سان بہت خوش ہوتے تھے۔ اس کا چہرہ مہرہ باوقار اور بارعب تھا۔ وہ طویل قامت اکہرے بدن کا آدمی تھا۔ سر سے گنجا تھا لیکن سر کے پچھلے حصے میں سفید بالوں کا ایک پتلا سا حاشیہ کھنچا ہوا تھا جو ایک کان کی لَو سے دوسرے کان کی لَو تک سفر کرتا دکھائی دیتا تھا۔ وہ اپنی سفید ریشمی داڑھی کو تراش کر رکھتا اور مہندی لگا کر اسے حنائی رنگ سے مزید دلکش بنا دیتا تھا۔ ساٹھ برس کی عمر میں بھی وہ تن کر چلتا تھا۔ یہی سب باتیں جمع ہو کر اُس کا وقار قائم رکھتی تھیں اور وہ حق پسند سا دکھائی دیتا تھا۔ اسے گاؤں کے لوگ امام بخش یا ملا کہہ کر نہیں بلکہ چاچا، کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

بھائی ست سنگھ کو اس قدر پیار اور احترام میسر نہیں تھا۔ وہ بھادوں کی تیز

دھوپ میں جھلسا ہوا جاٹ تھا جس نے کام کاج کی مشقت سے بچنے کے لیے دھرم میں پناہ لی تھی۔ اس کے پاس تھوڑی سی اپنی زمین بھی تھی جو اس نے ٹھیکے پر دے رکھی تھی۔ ٹھیکے سے ہونے والی آمدنی اور گوردوارے کی نذر سے اس کی گزر بسر نہایت سہولت سے ہو رہی تھی۔ اس کی اولاد تو تھی نہیں۔ اسے گوربانی یا مذہبی صحیفوں کا بھی کچھ زیادہ وقوف نہیں تھا اور نہ ہی اسے باسلیقہ گفتگو کا ڈھنگ آتا تھا۔ دیکھنے میں بھی وہ کوئی دانشمند ہستی نظر نہیں آتی تھی۔ وہ کوتاہ قد اور فربہی کی طرف مائل جسم رکھتا تھا۔ یوں بھی اس کے بدن پر بالوں نے یلغار کی ہوئی تھی۔ گو اس کی عمر بھی امام بخش کی عمر کے برابر تھی لیکن اس کی داڑھی کوئی خصوصی وقار قائم نہ کر سکی تھی۔ داڑھی کے بال کھچڑی تھے، یوں بھی وہ ڈھیلا ڈھالا اور سست سست نظر آتا تھا۔ وہ اپنی پگڑی صرف گورو گرنتھ صاحب کے پاٹھ کے وقت ہی سر پر جماتا۔ باقی سارا وقت ننگے سر بالوں کے ڈھیلے سے جوڑے کے نیچے لکڑی کا کنگھا اڑس کر پھرا کرتا تھا۔ اس کی گردن کے بہت سے بال اس کی گردن پر آبشار بنائے رکھتے۔ گرمیوں کے دنوں میں وہ کرتا بہت کم پہنتا۔ اس کا زیر جامہ ہی اس کی مکمل پوشاک ہوتی جو میل سے بدرنگ دکھائی دیتی تھی لیکن ست سنگھ ایک خاموش پر سکون اور خوش آدمی تھا اسے امام بخش سے کوئی کدورت نہیں تھی۔ وہ ہم قوموں کی طرف سے ودیعت کیے ہوئے فرائض نبھانے کی خاطر امام بخش کے تعویذوں کے بارے میں ہلکی پھلکی رائے زنی کر دیا کرتا تھا۔ ان کی بات چیت میں ہمیشہ دوستانہ رقابت کا رنگ جھلکتا تھا۔

یوں وہ روزانہ اشنان کرتا، گوربانی کا پاٹھ کرتا، گورو گرنتھ صاحب کی زیارت کرواتا اور سنتوکھن کے بعد ریشمیں رومالوں میں لپیٹ کر مہاراج کی ہستی کو آرام کے لیے رکھ دیتا۔ اس کے گوردوارے میں ایک طرف دو کمرے تھے جن میں وہ بھولے بھٹکے یا وقت بے وقت آئے مسافر کو پناہ دیتا تھا۔ ان میں سے ایک کمرے میں اس نے ایک بڑا سا کلنڈر لٹکا رکھا تھا جس پر گورو گوبند سنگھ جی کی تصویر تھی جو گھوڑے پر سوار دکھائے گئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں شاہین تھا اور سواری میں اسپ نیل فام، کیلنڈر کے ارد گرد دو کھونٹیاں اور بھی گڑی تھیں جن پر مسافر اپنے کپڑے یا استعمال کی دوسری اشیاء

لٹکائے تھے۔ گوردوارے کے پہلو میں بہت قریب ہی ایک کنواں تھا۔ جس کے چاروں جانب اونچا سا حصار کھنچا تھا۔ کنوئیں کے ساتھ ہی چار فٹ اونچا اینٹوں کا چبوترہ تھا جس پر "نشان صاحب" نصب تھا۔ نشان صاحب اپنے نشیبی آغاز سے چوٹی تک زرد رنگ کے کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کی چوٹی پر ایک زرد رنگ کا مثلث پرچم تھا، پرچم پر ایک گول دائرے کے نشان میں ایک تیغہ بنا تھا اور تیغے کے نیچے اور دائرے کی بیرونی سمت دو ایک دوسری کو کاٹتی تلواریں تھیں۔

اس دن گوردوارے میں ہونے والا اجتماع بہت ماتمی نوعیت کا تھا۔ کسی کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ تھا۔ اگر کوئی کچھ کہتا بھی تھا تو سہمے سہمے جیسے عالم بالا سے بول رہا ہو۔

امام بخش نے گھٹی گھٹی سی آواز میں کہا، "خدا خیر کرے، وقت بہت نازک ہے۔" سب نے ایک آہ بھر کر امام بخش کی تصدیق کی اور ست سنگھ بولا "ہاں چاچا! یہ کل جگ ہے۔"

پھر کوئی کچھ نہ بولا اور سب اپنے پاؤں کے بل بیٹھے کسمساتے رہے، کوئی انگڑائی لے کر کہہ دیتا "یا اللہ" اور کوئی "واہی گورو"۔

"نمبردار!" امام بخش نے پھر بات آگے بڑھائی "تمھیں تو علم ہوگا، یہ کیا ہو رہا ہے۔ ڈپٹی صاحب نے تمھیں کیوں نہیں بلایا؟"

"میں کیا جانوں چاچا، جب بلائیں گے چلا جاؤں گا، آج تو ڈپٹی بھی اسٹیشن پر ہی ہے۔ وہاں کسی کو بھی قریب جانے کی اجازت نہیں۔"

تب گاؤں کے ایک کڑیل نوجوان نے تنگ آکر کہا "ہم یوں ہی کیوں یہاں سڑتے رہیں؟ ہم ابھی پتہ چلاتے ہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ آخر گاڑی ہی تو ہے، زیادہ سے زیادہ سرکاری خزانے اور اسلحے سے بھری ہوگی۔ اسی باعث تو وہ قریب نہیں جانے دیتے۔ آپ نے سنا نہیں کہ بہت لوٹ مار مچی ہے؟"

"چپ رہ لڑکے" ایک عمر رسیدہ بزرگ نے اسے ٹوکا "جہاں بزرگ بیٹھے ہوں

وہاں تمہارے بولنے کی ضرورت نہیں۔"

"میں تو ... ..."

"بس ٹھیک ہے۔" بابا نے حاکمانہ لہجے میں کہا اور کچھ دیر کے لیے پھر کوئی نہ بولا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے" امام بخش نے سہمے سہمے اپنی داڑھی میں ہاتھ کی انگلیوں سے شانہ کرتے ہوئے کہا "گاڑی کو بڑے حادثے پیش آئے ہیں۔"

"حادثے" کا لفظ سن کر سبھی بے چین سے ہو گئے۔ "ہاں، بہت سی وارداتوں کا ذکر سننے میں آیا ہے" فوراً کرست سنگھ نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"بس ہم تو خیر ہی مانگتے ہیں خدا سے۔" امام بخش نے خود ہی چھیڑی بات کو از خود سمیٹنے کا جتن کرتے ہوئے کہا۔

"واہے گورو، واہے گورو۔" الاپ کر بھائی ست سنگھ نے بھی اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دیا۔

اور پھر کتنی ہی دیر منو ماجرا کے باشندے انگڑائیاں لیتے رہے "یا اللہ" اور "واہگورو" بڑبڑاتے رہے، ذرا فاصلے پر بیٹھے کچھ لوگ فرش پر لیٹے لیٹے ہی نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

عین اسی لمحے ایک سپاہی گوردوارے میں آدھمکا۔ نمبردار اور تین چار دوسرے آدمی اٹھ کر کھڑے ہو گئے، جو سوئے ہوئے تھے انھیں بھی ہلا ہلا کر جگا لیا گیا۔ جو اونگھ رہے تھے وہ "کیا بات ہے، کیا ہو گیا" کے استعجابی جملے کہتے اپنے سروں پر پگڑیاں کسنے لگے۔

"نمبردار کون ہے گاؤں کا؟" سپاہی نے پوچھا۔

بنتا سنگھ اس کے قریب چلا گیا۔ سپاہی نے ایک طرف لے جا کر اس کے کان میں کچھ کہا۔ اور پھر جب بنتا سنگھ واپس لوٹ رہا تھا تو سپاہی نے اونچی آواز میں کہا "جلدی آدھ گھنٹے کے اندر اندر۔ اسٹیشن کے ایک پہلو کی سمت ملٹری کے دو ٹرک کھڑے ہیں، میں وہیں ہوں گا۔"

یہ کہہ کر سپاہی چلا گیا۔ گاؤں کے سارے لوگ بنتا سنگھ کے اردگرد اکٹھے

ہو گئے۔ اسے راز کی بات کا علم تھا اور اسی باعث اس کی آواز میں تحکم تھا۔ "سبھی اپنے اپنے گھروں سے جتنی لکڑی اور جتنا مٹی کا تیل دستیاب ہو، لے آؤ، اور سب کچھ اسٹیشن کے پاس کھڑے ٹرکوں تک پہنچا دو، تمھیں معاوضہ ملے گا۔"

سارے گاؤں والے اس کا سبب جاننے کے لیے بے چین ہوئے تو نمبردار سرزنش کے لہجے میں بولا "تم بہرے ہو؟ تمھیں سنائی نہیں دیا؟ تم پولیس کے ڈنڈے برداشت کرنے کی خواہش میں تو مبتلا نہیں ہو، چلو جلدی کرو۔"

سب ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے اپنے راستے پر چل دیے۔ نمبردار اپنے گھر کی طرف نکل گیا۔

چند لمحوں بعد سبھی اہل منو ماجرا سروں پر لکڑیاں اور ہاتھوں میں مٹی کے تیل کی بوتلیں تھامے گاؤں کی بیرونی سمت اسٹیشن کی طرف اکٹھے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ سبز مٹیالے رنگ کے دو ٹرک ایک دوسرے سے لگ کر کھڑے ہوئے تھے۔ مٹی کی ایک خستہ سی دیوار کے ساتھ پٹرول کے خالی گیلنوں کی قطار لگی تھی۔ ایک اسٹین گن بردار سکھ فوجی نگرانی پر مامور تھا۔ ایک دوسرا ٹرک کے عقب میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا، وہ دوسرے ٹرک میں بھری جانے والی لکڑیوں کی طرف دیکھتا اور اہل منو ماجرا کے ست سری اکال کے جواب میں رسمی طور پر سر جھکا دیتا۔ ایک طرف نمبردار کھڑا گاؤں والوں کے نام اور ایک ایک کر کے گھر سے آئی اشیا کا اندراج کر رہا تھا۔ اپنے سروں پر اٹھائی ہوئی لکڑیاں ٹرک میں پھینک کر، ہاتھوں میں پکڑی تیل کی بوتلیں پٹرول کے خالی گیلنوں میں الٹ کر سبھی ایک طرف سکھ افسر سے ذرا فاصلے پر ایک دوسرے کے پاس کھڑے ہو گئے۔

امام بخش نے اپنے سر سے لکڑیاں اتار کر ٹرک میں پھینک دیں اور ہاتھ میں تھامی تیل کی بوتل نمبردار کے ہاتھ میں دے دی۔ وہ سر سے کھل کر بکھرتی پگڑی کو سمیٹتا سکھ افسر کو مخاطب کر کے بولا "سلام سردار صاحب!"

سردار صاحب نے جواب دیے بغیر دوسری طرف جھانکنا شروع کر دیا۔
امام بخش نے پھر کہا "سب ٹھیک تو ہے؟ ہے نا، سردار صاحب! سردار صاحب

نے فوراً اس کی طرف مُنہ گھمایا اور کہا "جاجا، تمھیں دکھائی نہیں دیتا میں کام کر رہا ہوں۔"
امام بخش پگڑی پیٹتا پھر گاؤں والوں کے ساتھ شامل ہو گیا۔
جب دونوں ٹرک بھر چکے تو سکھ افسر نے بنتا سنگھ سے کہا کہ وہ اگلے دن کیمپ سے ان چیزوں کے دام وصول کر لے۔
ٹرک اسٹیشن کی جانب چل دیے اور گاؤں کے لوگ بنتا سنگھ کے چاروں طرف کھڑے ہو گئے۔ نمبردار کو کچھ یوں محسوس ہوا جیسے اسی کے باعث نمبردار کی بے عزتی ہو گئی ہو۔ گاؤں والوں کا صبر کا پیالہ یوں ہی چھلک رہا تھا "اوئے، نمبردارا، تم ہمیں کچھ بتاتے کیوں نہیں؟ ایسی کون سی بات ہے جو تم چھپاتے پھر رہے ہو۔ تم سمجھتے ہو تم بڑے آدمی بن گئے ہو اور ہم سے بات تک نہیں کرتے" ست سنگھ نے غصے میں آ کر کہا۔
"نہیں، بھائی، نہیں۔ اگر مجھے علم ہو تو میں کیوں نہ بتاؤں؟ تم تو بچوں کی سی باتیں کر رہے ہو۔ میں پولیس اور فوجیوں سے کیسے پوچھ سکتا ہوں۔ انھوں نے مجھے کچھ بتایا ہی نہیں۔ تم لوگوں نے دیکھا نہیں وہ چاچے کے ساتھ کیسے بگڑا تھا سور کا بچہ؟ آدمی کی عزت اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ مجھے کیا ضرورت تھی کہ میں اپنی پگڑی اچھلواتا؟"
یہ سن کر امام بخش اپنی ابھی ابھی ہونے والی بے عزتی کو فراموش کر بیٹھا اور نمبردار کی حمایت کرتے ہوئے بولا "اگر کوئی تمھاری بات کے جواب میں کھانے کو دوڑے تو تمھیں ضرورت ہی کیا ہے بات کرنے کی۔ چلو اپنے گھروں کو چلتے ہیں۔ چھتوں پر کھڑے ہو کر دیکھتے ہیں، یہ کیا کر رہے ہیں۔"
سبھی وہاں سے رخصت ہو کر اپنے گھروں کی چھتوں پر جا کھڑے ہوئے۔ وہاں سے انھیں اسٹیشن کے قریب بنے کیمپ کے پاس جاتے ہوئے ٹرک اچھی طرح نظر آنے لگے۔ پھر وہ ٹرک ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ سگنل سے بھی اُدھر چلے گئے اور پھر انھوں نے بائیں جانب مڑ کر پٹڑی پار کی اور پھر ایک بار بائیں جانب مڑ کر ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ واپس اسٹیشن کی جانب چلے آئے۔ جہاں یہ ٹرک آنے والی دوسری گاڑی کی اوٹ میں چلے گئے۔
شام کے وقت منو ماجرا کے سبھی لوگ چھتوں پر کھڑے ایک دوسرے سے استفسار

کرتے رہے کہ کسی کو کچھ دکھائی دیا ہے یا نہیں۔ اسی تذبذب میں وہ دوپہر کا کھانا تیار کرنا بھی بھول گئے۔ ماؤں نے اپنے بچّوں کو باسی روٹیوں کے ساتھ بہلا دیا۔ انھیں چولہے تک جلانے کی فرصت نہیں تھی۔ کسی نے اپنے مویشیوں کو چارہ نہ ڈالا۔ دودھیل جانوروں کو دوہنا تک بھول گئے جب سورج پُل کے آہنی فریم کے عقب میں چلا گیا تو کہیں انھیں احساس ہوا کہ وہ گھر کے سارے کاموں کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔ اندھیرا اُترنے والا تھا، بچّوں نے روٹی مانگنی تھی۔ لیکن عورتیں اب بھی چھتوں پر کھڑی ٹکٹکی باندھے گاڑی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ بھوکے مویشی چارے کے خالی استھانوں پر کھڑے ہانپ رہے تھے۔ لیکن پھر بھی مرد اسٹیشن کی طرف ہی دیکھتے چلے جا رہے تھے اب کچھ ہوا ہی چاہتا ہے۔ سبھی یہی سوچ رہے تھے۔

سورج پُل کی اوٹ میں چھپ گیا۔ سفید بادلوں میں کئی رنگ گھل گئے۔ آہستہ آہستہ جھٹپٹا سا ہو کر چاروں طرف پھیل گیا۔ اسٹیشن ایک سیاہ دیوار بن کر رہ گیا۔ تھک ہار کر سبھی عورتیں اور مرد ایک دوسرے کو صدائیں دیتے چھتوں سے نیچے اُتر گئے۔

شمالی اُفق جو جامنی ہو چکا تھا ایک بار پھر سنگتری ہو گیا اور پھر یہ تانبے کا روپ اختیار کر کے سُرخ شعاعیں چھوڑنے لگا۔ آگ کے سرخ شعلے آسمان کی طرف جھپٹنے لگے۔ گاؤں کی جانب ہلکی ہلکی ہوا کے ہلکورے پیش قدمی کرنے لگے۔ اس میں جلتے ہوئے سنتی تیل اور لکڑیوں کی باس تھی اور پھر یہی باس جلتے ہوئے گوشت کی سڑاند میں تبدیل ہو گئی۔

سارے گاؤں پر مرگھٹوں کا سناٹا مسلط ہو گیا۔ کسی نے کسی سے اس آدم بو کے بارے میں سوال نہ کیا۔ وہ سب جانتے تھے، وہ پہلے بھی جانتے تھے۔

یہ بات واضح تھی کہ گاڑی پاکستان سے آئی تھی۔

منو ماجرا کی یادداشت میں یہ پہلی رات تھی جب انھیں امام بخش کی خدا کے حضور میں دی جانے والی "اللہ اکبر" کی گونجیلی اذان سنائی نہ دی۔

دن کی واردات نے ڈاک بنگلے میں بھی اُداسی پھیلا دی تھی۔ ڈپٹی حکم چند جی

صبح سے ہی باہر گئے ہوئے تھے۔ دوپہر کو ڈپٹی صاحب کے لیے تھرمس میں چائے لینے کے لیے آئے اردلی نے بیرے اور بھنگی کو لاشوں سے بھری ہوئی گاڑی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ سورج غروب ہو جانے کے بعد نوکروں، چاکروں اور بھنگیوں وغیرہ نے چھتوں کے اوپر سے اٹھتے ہوئے آگ کے الاؤ کو دیکھا تھا۔ آگ کے الاؤ نے ڈاک بنگلے کی خاکی دیواروں پر اُداسی اور سوگ سا بچھا دیا تھا۔

دن بھر کی بھاگ دوڑ نے ڈپٹی صاحب کو تقریباً بے حال کر دیا تھا۔ اس کی تھکن جسمانی نہیں تھی۔ اتنی بہت سی لاشوں نے اس پر سکتہ طاری کر دیا تھا۔ چند ہی گھنٹوں میں اس کے سارے اعضا سُن ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ ڈبوں میں سے گھسیٹ کر نکالی جانے والی لاشوں کا نظارہ کرتا رہا تھا۔ نکالنے والے انھیں یوں گھسیٹ رہے تھے جیسے وہ ٹرنک یا صندوق ہوں۔ شام کے وقت وہ بہت ہی اُداس ہو گیا۔ جب وہ ڈاک بنگلے میں پہنچ کر کار میں سے نکلا تو تھکن سے چور اور احساسِ شکست سے دوچار نظر آتا تھا۔ اُس وقت تک بیرا، بھنگی اور اُن کے افرادِ خاندان چھتوں پر کھڑے ہو کر جلتے ہوئے الاؤ کو دیکھنے جا رہے تھے۔ تھکے ہارے ڈپٹی کو دروازے بھی کھلے نہ ملے۔ یہ دروازے چھت پر کھڑے ملازمین نے ہی کھولنے تھے۔ اس کے غسل کا انتظام بھی کسی نے نہ کیا تھا۔ اسے اور بھی بہت سی بھولی بسری اور اُداسی باتیں یاد آنے لگیں۔ وہ خاموش بستر میں ڈھے گیا۔ ایک ملازم نے اس کے بوٹوں کے تسمے کھول کر بوٹ اتارے اور اس کے پاؤں دابنے شروع کیے۔ دوسرے نے پانی کی بالٹیاں لا کر ٹب بھر دیا۔ نوکر کو ٹھوکر سے پیچھے ہٹا کر ڈپٹی صاحب غسل خانے میں جا گھسے۔

غسل کرنے کے بعد کپڑے بدل کر انھوں نے ذرا اطمینان کا سانس لیا اور حواس بحال کیے۔ ڈپٹی صاحب اپنی آنکھیں مل کر پھر بستر میں دراز ہو گئے۔ بند آنکھوں کی تیرگی میں انھیں دن بھر کے مناظر خواب سے بن کر دکھائی دینے لگے۔ وہ اپنی انگلیوں کی پوروں کو آنکھوں میں گاڑ کر ان مناظر کو بھول جانا چاہتے تھے۔ انھیں بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کی سربریدہ اور کٹی پھٹی لاشیں دکھائی دینے لگیں۔ کچھ لاشیں ریل کے ڈبے کی دیوار سے ہم

چھپے ہوئے لوگوں کی تھیں جو باہر سے آتی ہوئی گولیوں کا سامنا کرتے ہی مارے گئے تھے۔ کچھ نوعمر لڑکوں کی لاشیں بیت الخلا میں تھیں جنھوں نے بزور خود کو بچانے کا جتن کیا تھا سب سے واضح تصویر جو ڈپٹی صاحب کی آنکھوں کے سامنے گھومی، ایک لمبی اور سفید داڑھی والے بزرگ کی تھی جو سامان کے لیے بنائے گئے بالائی تختے پر بستروں کے درمیان بیٹھا نیچے موت کے جبڑوں میں لیٹے لوگوں کو دیکھتے دیکھتے خود بھی موت بن گیا تھا اس کے کان کے پاس سے تھوڑا سا لہو رِس کر داڑھی کی طرف آتا دکھائی دے رہا تھا۔ ڈپٹی صاحب نے اس کو زندہ سمجھ کر 'بابا! بابا!' کہہ کر بلانے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت اس کا سر وہاتھ اس بے ڈھب انداز میں ڈپٹی صاحب کے دائیں پاؤں پر آ کر ٹِک گیا کہ اُن کا سارا جسم ٹھنڈی شبنم سے بھیگ گیا۔ پھر ڈپٹی صاحب نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ اُن کی آواز نکل نہیں سکی تھی۔ یہ تصویریں ان کی آنکھوں کے آگے گھومی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئے انھوں نے دیکھا کہ ان کا بیرا بھی اسی طرح سہم کر ان کے سرہانے کھڑا تھا۔

"میں نے سوچا آپ تھک گئے ہوں گے، ذرا پاؤں دبا دوں" اس نے کہا۔

ڈپٹی صاحب سے کچھ بولا نہ گیا۔ خود ہی اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر — "ہائے رام، ہائے رام" کرتے سرہانے پر گر گئے۔ ہائے رام نے کسی حد تک اُن کا خوف دور کر دیا تھا! انھوں نے بیرے کو وہسکی لانے کے لیے کہا وہ فوراً وہسکی، سوڈا اور گلاس لے کر آ گیا۔ ڈپٹی صاحب نے شہد کے رنگ کی شراب کے ساتھ ایک چوتھائی گلاس بھر لیا۔ بیرے نے باقی تین چوتھائی سوڈا ڈال دیا۔ ڈپٹی صاحب ایک ہی سانس میں نصف گلاس خالی کر گئے۔ نوکر نے ان کے پاؤں دبانے شروع کر دیے۔ انھوں نے باقیماندہ وہسکی بھی ایک ہی سانس میں کھینچ لی اور پھر دراز ہو گئے۔ لیٹے لیٹے انھیں پیارے دوستوں اور رشتہ داروں کی موتیں یاد آئیں۔ اُن کی تڑپ تڑپ کر نکلتی جان کا منظر ان کے سامنے گھوم گیا۔ وہسکی بھی اُن کو ان ہیبت ناک خوابوں سے رہائی نہ دلا سکی تھی۔

کار کی بتیاں جلنے پر ان کی روشنی ڈپٹی صاحب کے کمرے میں جھلکی۔ شاید کسی نے کار گیراج میں کھڑی کی تھی اور پھر ڈپٹی صاحب کو سر پر کھڑی رات کے اندھیرے کا احساس ہونے

لگا۔ نوکروں نے اپنے اپنے کوارٹروں میں جا کر سونا تھا۔ ڈپٹی صاحب نے کمرے میں تنہا رہ جانا تھا اور ان کے اپنے جنم دیے ہوئے خوف باقی رہ جانے تھے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے اردلیوں کو قریب ہی سلائیں گے۔

"بیرا!" ڈپٹی صاحب نے آواز دی۔

"جی صاحب!" بیرے نے جالی دار دروازے میں سے گزرتے ہوئے پوچھا۔

"تم نے سونے کے لیے میری چارپائی کہاں بچھائی ہے؟"

"ابھی بستر نہیں بچھایا صاحب، بادل اُمڈے ہوئے ہیں۔ شاید بارش ہو، کیا حضور برآمدے میں سونا پسند کریں گے؟"

"نہیں، میں اپنے کمرے میں ہی رہوں گا، لڑکے سے کہنا، گھنٹہ دو گھنٹہ کے لیے پنکھا کھینچتا رہے جب تک کہ کمرا ٹھنڈا نہیں ہو جاتا۔ اردلیوں سے کہنا برآمدے میں سو جائیں۔" یہ کہہ کر ڈپٹی صاحب کو احساس ہوا کہ کہیں بیرے کو شک نہ ہو جائے کہ وہ ڈرتے ہیں۔

"ہو سکتا ہے مجھے رات میں ان کی ضرورت پڑے" انھوں نے شک دور کرنے کے سے انداز میں کہا۔

"جی صاحب! جو آپ کا ارشاد، غلام کس لیے ہے؛ کھانا بھی لاؤں صاحب؟"

حکم چند رات کا کھانا تقریباً بھول چکا تھا۔ "نہیں، نہیں! میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ بس اردلیوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی چارپائیاں برآمدے میں بچھالیں ڈرائیور سے بھی کہنا آس پاس رہے۔ اگر برآمدے میں جگہ کم ہو تو برابر والے کمرے میں سو جائے۔"

بیرا چلا گیا، اشری حکم چند کو اطمینان سا ہو گیا کہ اتنے لوگوں کے درمیان وہ بے فکری کی نیند سو سکتے ہیں اور پھر نوکروں کی کھسر پھسر سن کر انھیں اور بھی تسلی ہوئی۔ وہ برآمدے میں جگہ کے لیے لڑ رہے تھے۔ ان کے دروازے کے بالکل سامنے چارپائیاں بچھ رہی تھیں۔ برابر والے کمرے میں روشنی جلا کر سامان ایک طرف کیا جا رہا تھا اور چارپائی بچھانے کے لیے جگہ بنائی جا رہی تھی۔

باہر سے آنے والی کار کی ہیڈ لائٹس نے کمرے میں ایک بار پھر روشنی بکھیر دی۔

کار برآمدے کے بالکل باہر رک گئی۔ ڈپٹی صاحب کو عورتوں اور مردوں کی ملی جلی آوازیں اور گھنگھروں کی چھنا چھن سُنائی دینے لگی۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئے اور انھوں نے جالی دار دروازے میں سے بوڑھی کھوسٹ اور کم سن مٹیار کو دیکھا، وہ اس لڑکی کی بابت بھول ہی چکے تھے۔ اگر لڑکی نے آنا تھا تو پھر انھیں اردلیوں کو پاس سُلانے کی کیا ضرورت تھی۔

"بیرا!" ڈپٹی صاحب نے آواز دی۔

"حضور!" بیرے نے جواب دیا۔

ڈرائیور سے کہو بڑھیا کو واپس لے جائے اور نوکروں کو ان کے کوارٹر میں بھجوادو، اگر مجھے ضرورت ہوئی تو میں انھیں بلوالوں گا۔"

خوف کے عالم میں ڈپٹی صاحب پر اردو طاری ہوگئی تھی۔ انھوں نے سوچا نوکر اس بات پر ہنسیں گے لیکن انھوں نے کوئی پروا نہ کی۔ انھوں نے اپنے پیگ میں مزید وسکی انڈیل لی۔

بیرے کے کہنے سے پہلے ہی نوکر جاکر باہر نکلنے لگ گئے۔ برابر والے کمرے سے روشنی غائب ہوگئی۔ ڈرائیور نے کار دوبارہ اسٹارٹ کرلی۔ اس نے کار کی روشنیاں جلائیں۔ بڑھیا کار میں بیٹھنے پر تیار نہیں تھی، بتیاں پھر بجھ گئیں۔ بڑھیا بیرے سے جھگڑتی رہی اور پھر اس نے اندر ڈپٹی صاحب کو سُنانے کی خاطر کہنا شروع کیا "جناب کی بادشاہی سدا سلامت رہے حضور کا قلم لاکھوں، ہزاروں پر چلے۔"

ڈپٹی صاحب کو غصہ آگیا، "جاؤ" انھوں نے پوری شدت سے پکارا۔

"آپ نے ابھی میرے پچھلے دن کے پورے پیسے نہیں چکائے۔"

"جاؤ، بیرا! اسے دفع کراؤ۔"

بڑھیا خاموشی سے کار میں بیٹھ گئی۔ کار چلی گئی اور نوکروں نے بھی برآمدے خالی کر دیے۔

کمرے میں بس ڈپٹی صاحب اور رقاصہ لڑکی ہی رہ گئے۔ لڑکی کی کالی ساڑھی کے چمکدار

ستاروں پر لال ٹین کی روشنی پڑتے ہی کمرے کی دیواروں اور چھت پر روشنی کے موتی سے جھلملانے لگے۔ ڈپٹی صاحب نے پیچھے مڑکر لڑکی کی طرف دیکھا، وہ اپنی بڑی بڑی سیاہ غلافی پلکیں اٹھائے انھیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی ٹونگ کا ہیرا جگمگ کر رہا تھا۔ وہ بہت زیادہ خوف زدہ لگتی تھی۔

"آؤ!" ڈپٹی صاحب نے اسے بازو سے پکڑکر کھینچتے اور اپنے پاس اس کے لیے جگہ بناتے ہوئے کہا۔

لڑکی چارپائی کے پائے پر بیٹھ کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ حکم چند نے اپنا بازو اس کی کمر کے گرد حائل کیا اور پھر وہ اس کے جسم کے نرم و نازک خطوط کے ساتھ کھیلنے لگے۔ وہ اسی طرح یخ بستہ بیٹھی رہی۔

"آؤ، لیٹ جاؤ" اندھیرے میں اس کی ساڑھی کے سلمے ستارے چمک رہے تھے۔ اس کے منہ سے الائچی کی مہک آرہی تھی اور جسم سے شہد کی۔ بچوں جیسی لڑکی کی بغلوں میں گھستے ہی ڈپٹی صاحب بے خبر سو گئے۔

بادل کی گرج کے ساتھ ڈپٹی صاحب کی آنکھ کھل گئی۔ انھوں نے جاگ کر دیکھا، کمرے میں لال ٹین کی دھندلی سی روشنی تھی۔ لال ٹین کے شیشے میں سے ایک تھکی ہوئی زرد سی شعلگی بھڑکتی دکھائی دی۔ ایک بار کمرے میں پھر سے بجلی کا کوندا لپکا اور ایک بار پھر سے گرج سنائی دی۔ ٹھنڈی اور بھیگی ہوئی ہوا کا ایک جھونکا کمرے میں سے آر پار ہو گیا۔ لال ٹین بھڑک کر بجھ گئی۔ رم جھم رم جھم برکھا برس پڑی۔

برکھا، ڈپٹی صاحب کو گمان گزرا، بارش آ ہی گئی تھی۔ بہت جاتنوں اور مرادوں کے بعد آئی تھی۔ نہیں تو بادل گھرتے اور اوپر اوپر سے پیاسی زمین کی پیاس کو دو چند کر کے چلے جاتے۔ برکھا رت کے لیے ستمبر آخری مہینہ ہے لیکن شاید اسی تاخیر کے باعث ہی یہ بارش اچھی لگتی ہے۔ اس کی خوشبو بہت سوندھی تھی، اس کی آواز میں سنگیت تھا۔ اس کا نظارہ خوب تھا۔ اور سب سے بڑھ کر اس کا اثر خوب تھا۔

بیرا شیو کا سامان اور چائے لا کر میز پر رکھ گیا تھا۔ ڈپٹی صاحب نے اپنے لیے چائے

کا ایک کپ بنایا اور شیو کا سامان میز پر پھیلا دیا۔ وہ شیو بھی بناتے گئے اور گھونٹ گھونٹ کر کے چائے بھی پیتے گئے۔ چینی اور چاندی کے برتنوں کی آواز شاید بستر پر سوئی ہوئی اُس کم سن لڑکی کے کانوں میں بالکل نہیں پڑی تھی۔ اس کا سینہ میں تھوڑا سا منہ کھلا تھا وہ بالکل بے حس پڑی تھی۔ ہاں اس کے ہر سانس کے ساتھ اس کی چھاتیاں اوپر کی جانب اُبھر کر اُس کے ادھ کھلے بریسیئر کو بھر دینے کا ناکام سا جتن کر رہی تھیں۔ اس کے بال اس کے چہرے پر کھلتے ہوئے بکھرے پڑے تھے۔ ایک سورج کی شکل والا گلابی رنگ کا پلاسٹک کا کلپ اس کے بالوں کی ایک لٹ میں اٹکا چارپائی کے پائے سے لٹک رہا تھا۔ اس کی ساڑھی چڑمُڑا کر شکن شکن سلوٹ سلوٹ ہو رہی تھی اور اس کے آسمان سے کوئی کوئی ستارہ ٹوٹ کر زمین برد ہو گیا تھا۔ چائے پیتے اور شیو بناتے ڈپٹی صاحب کی نگاہیں اس کے جسم میں ہی پیوست تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں لیکن وہ اسے منانا چاہتے تھے، وہ جو کچھ بھی چاہتی کرنے پر تیار تھے۔ اس کے ساتھ سونے کے لیے تیار تھے اور ساتھ سونے کا خیال کر کے ڈپٹی صاحب ایک بار پھر بے چین ہو گئے۔ وہ ویسکی سے سیر ہوئے بغیر اس کے ساتھ بھی نہیں سو سکتے تھے۔

برآمدے میں کسی کے قدموں کی چاپ اور کسی کے کھنکھارنے کی آواز نے ان کی سوچ کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ یہ کھنکھارہ کسی نے ان کو توجہ دلانے کے لیے ہی وضع کیا تھا اور یہ تھانیدار ہی ہو سکتا تھا۔ حکم چند نے چائے ختم کی اور غسل خانے میں جا کر اپنا لباس تبدیل کر لیا۔ اور پھر وہ کوارٹروں کی جانب سے ہوتے برآمدے میں آ گئے۔ تھانیدار کرسی پر بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ ڈپٹی صاحب کو دیکھ کر وہ بہ یک جنبش اٹھا اور سلیوٹ کیا۔

"آپ بارش میں سیر کر رہے تھے" تھانیدار نے پوچھا۔

"نہیں، میں تو یونہی نوکروں کی اقامت گاہوں تک گیا تھا۔ آج صبح کیسے صورتِ حال قابو میں تو ہے؟"

"ان دنوں تو دم غنیمت ہے، کہیں بھی چین نہیں ایک کے بعد ایک مصیبت..."

ڈپٹی صاحب کو یکایک گاڑی کی لاشوں کا دھیان آیا "رات بارش تو نہیں ہوئی؟"

اسٹیشن پر کیا حال ہے ؟"

"میں صبح بارش ہونے پر گیا تھا، وہاں کچھ نہیں۔ راکھ اور ہڈیوں کے بڑے بڑے ڈھیر میں کھوپڑیاں ہی کھوپڑیاں دکھائی دیتی ہیں۔ میں سمجھ نہیں پایا کہ انھیں کس طرح ٹھکانے لگایا جائے۔ ویسے میں نے نمبردار کو پیغام بھجوا دیا ہے کہ کسی کو بھی یا اسٹیشن کے نزدیک نہ آنے دیا جائے۔"

"کتنی تھیں لاشیں ؟ گنی تھیں ؟"

"میں نے تو شمار نہیں کیں۔ فوجی افسروں کا خیال ہے کہ ہزار سے زیادہ تھیں میرا خیال ہے کہ اس نے بھی گاڑی کے ڈبوں میں سواریوں کی گنجائش ہی سے اندازہ لگایا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ پانچ سو کے قریب آدمی گاڑی کی چھت پر یا ادھر ادھر لٹکتے بھی مارے گئے ہوں گے اور وہ راستے ہی میں گر کر بکھر گئے ہوں گے۔ گاڑی کی چھت پر بہت سا خون جما ہوا تھا۔"

"ہرے رام! ہرے رام! پندرہ سو بے گناہ آدمی! قیامت آ گئی۔ یہ کل یگ ہی تو ہے۔ اگر سرحد کے ایک حصے پر یہ واردات ہوئی ہے تو باقی جگہوں پر کیا حشر اٹھا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمارے ہندو بھی کوئی رو رعایت روا نہیں رکھیں گے۔ کیا حالت ہے مسلمانوں کی ان دیہات میں ؟"

"یہی تو بتانے آیا ہوں، آپ کو کئی دیہات کے مسلمانوں نے تو مہاجر کیمپوں کو جانا شروع کر دیا ہے۔ نصف چندر نگر خالی ہو چکا ہے۔ جہاں کسی مسلمان کے آثار ملتے ہیں پاکستانی لاریوں کے بلوچ اور پٹھان فوجی انھیں سوار کر کے لے جاتے ہیں۔ لیکن منو ماجرا کے مسلمان ابھی تک کٹے ہوئے ہیں۔ آج صبح نمبردار نے اطلاع دی ہے کہ چالیس پچاس کے قریب سکھ شرنارتھی ستلج کا گھاٹ عبور کر کے منو ماجرا پہنچ گئے ہیں، ابھی وہ سب گوردوارے میں مقیم ہیں۔"

"یہ غلط ہے، بالکل غلط، انھیں منو ماجرا میں کیوں ٹھہرنے دیا گیا ہے تمھیں علم ہے کہ ادھر سے آنے والے تمام شرنارتھیوں کو جالندھر کیمپ بھیجنے کے احکامات جاری ہوئے

ہیں۔ ان کا یہاں پڑاؤ خطرناک ہے۔ وہ منو ماجرا میں قتل و غارت گری برپا کر دیں گے۔"

"نہیں حضور! ایسا حال سب ٹھیک ہے۔ ان شرنارتھیوں کا پاکستان میں کوئی جانی مالی نقصان نہیں ہوا۔ یوں بھی منو ماجرا کے مسلمان انھیں گوردوارے میں اناج لا لا کر دے رہے ہیں۔ خطرہ اسی صورت میں لاحق ہو سکتا ہے جب ایسے شرنارتھی آئیں جن کا نقصان ہوا ہو۔ یوں بھی بارش نہ ہونے کے باعث دریا میں پانی کم ہے اور بہت سے گھاٹ آسانی سے عبور کیے جا سکتے ہیں، میں کون کون سے گھاٹوں پر پولیس کا پہرہ لگا سکتا ہوں؟"

حکم چند نے ڈاک بنگلے سے باہر کھیتوں کی طرف دیکھا۔ بارش دھیرے دھیرے برس رہی تھی۔ کہیں کہیں جوہڑوں نے روپ دھار لیا تھا۔ بادل گھرے تھے۔ آسمان پر کاہی اور سلیٹی رنگ کی چادر سی بچھی تھی "ہاں اگر بارش ہوتی رہی تو دریا کی سطح بلند ہونے کے باعث گھاٹوں کے پایاب بند ہو جائیں گے اور پھر پل پر سے گزرتے شرنارتھی کو قابو میں رکھنا آسان ہوگا" ڈپٹی صاحب نے پرامید ہو کر کہا "لیکن ہمیں چاہیے کہ ہم سارے مسلمانوں کو یہاں سے رخصت کر دیں۔ یہ کام جتنی جلدی ہو سکے اچھا ہے۔"

پھر کتنی ہی دیر نہ تو تھانیدار صاحب نے ہی کوئی بات کی اور نہ ہی ڈپٹی صاحب نے۔ کچھ دیر غور کرنے کے بعد ڈپٹی صاحب پھر بولے "اچھا" وہ رام لال کے قتل کا کیا ہوا؟ اور گرفتاریاں ہوئی ہیں یا نہیں؟"

"ہاں، حضور ہوئی ہیں۔ جگے بدمعاش نے ہمیں کل ڈاکوؤں کے نام دیے تھے۔ وہی لوگ ہیں جو کسی وقت جگے کے گروپ کے ارکان تھے۔ ملی اور کبوترے کے چار اور بدمعاش لیکن جگا ان کے ساتھ نہیں تھا۔ میں نے کچھ سپاہی ان ڈاکوؤں کی گرفتاری کے لیے بھجوا رکھے ہیں۔" لیکن ڈپٹی صاحب تھانیدار کی بات نہیں سن رہے تھے۔ جیسے انھیں اس بات سے کوئی دلچسپی ہی نہ ہو' ان کی نظر کہیں دور لگی تھی۔ ان کے پاس تھانیدار سے کرنے کے لیے اور کوئی بات ہی نہیں تھی۔ شاید اسی لیے انھوں نے قتل کا تذکرہ چھیڑ دیا تھا۔

"ہم نے جگے کو گرفتار کر کے غلطی کی ہے" تھانیدار کہتا رہا "وہ اس سلسلے میں بے گناہ ہے۔ میں نے آپ سے جولاہوں کی بیٹی کا ذکر کیا تھا جگا بیشتر راتیں اسی کے ساتھ بتاتا رہا ہے۔ جگے کے صحن میں چوڑیاں ملہی نے ہی پھینکی تھیں ـــــ ڈکیتی کی واردات کے بعد" ڈپٹی صاحب ابھی تک کہیں کھوئے ہوئے تھے۔ تھانیدار نے قدرے توقف کے بعد کہا " اگر جناب کا حکم ہو تو ہم ملہی اور اس کے ٹولے کی گرفتاری کے بعد جگے کو رہا کر دیں۔"

"ملہی اور اس کے ساتھی کون؟ مسلمان یا سکھ؟" ڈپٹی صاحب نے یکایک سوال کیا۔

" سکھ ہیں حضور!" تھانیدار بولا۔

ڈپٹی صاحب پھر اپنی سوچوں میں ڈوب گئے۔ ذرا رک کر انھوں نے خود کلامی شروع کر دی" اگر مسلمان ہوتے تو کام بہت آسان تھا، تو شاید منو ماجرا کے سکھ مسلمانوں کو اپنے آپ ہی گاؤں سے ہانک دیتے۔"

سوچتے سوچتے ان کے ذہن میں جانے کیا خیال آیا کہ انھوں نے تھانیدار کو حکم دیا" ملہی اور اس کے آدمیوں کو بغیر کسی اندراج کے رہا کر دو لیکن ان کی حرکتوں پر نظر رکھنا، انھیں ہم پھر گرفتار کر لیں گے لیکن اس بدمعاش کو نہ چھوڑنا، ہمیں اس کی ضرورت پڑے گی۔" تھانیدار نے رخصت ہونے کے لیے سلیوٹ کیا۔

"ٹھہرو، ایک بات اور بھی ہے" ڈپٹی صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے تھانیدار کو بلایا،" یہ سب کچھ کرنے کے بعد مسلمان مہاجر کیمپ کے کمانڈر کو پیغام بھجوا دینا کہ وہ منو ماجرا کے مسلمانوں کو لے جانے کے لیے ٹرک بھجوا دے" تھانیدار نے دوبارہ سلیوٹ مارا، وہ خوش تھا کہ ڈپٹی صاحب نے کتنا اہم کام اسے سونپا تھا۔ اس نے برساتی اوڑھ لی۔

"میں تمھیں بارش میں یہ تکلیف نہ دیتا، معاملہ ہی کچھ ایسا ہے" ڈپٹی صاحب نے زمین کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں جانتا ہوں جناب!" تھانیدار نے ایک اور سلیوٹ مار کر کہا" میں ابھی حکم کی

تعمیل کرتا ہوں۔" وہ اپنی سائیکل پر سوار ہو کر ڈاک بنگلے کے باہر کچی کیچڑ بھری سڑک پر نکل گیا۔

ڈپٹی صاحب خوش تھے کہ "بچے" کو جیل میں قید رکھنے کے اقدام کے ذریعے وہ مہاجرا کے مسلمانوں کو نکال باہر کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ وہ اپنے آپ کو تسلی دے کر خوش ہو رہے تھے کہ انھوں نے تھانیدار کو اپنی اسکیم سے آگاہ نہیں کیا تھا۔

ڈاک بنگلے میں غسل خانے کی چٹخنی بند ہو کر پھر کھلنے کی آواز آئی۔ ڈپٹی صاحب کھڑے ہو گئے اور انھوں نے بیرے کو ناشتہ لانے کا حکم دیا۔ اندر جا کے انھوں نے دیکھا کہ وہ لڑکی اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے چارپائی کے کنارے بیٹھی کچھ سوچ رہی ہے۔ ڈپٹی صاحب کو دیکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے اپنا سر اپنی ساڑھی کے پلّو سے ڈھانپ لیا۔ جب ڈپٹی صاحب کرسی پر بیٹھ گئے تو وہ بھی چارپائی پر بیٹھ کر زمین کو تکنے لگی۔ ڈپٹی صاحب نے خود کو حوصلہ دے کر، کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولے "تم ناراض تو نہیں؟ ناشتہ آ رہا ہے، میں نے بیرے سے کہہ دیا ہے۔"

لڑکی نے اپنی بڑی بڑی اداس آنکھیں ڈپٹی صاحب کی طرف گھما کر کہا "میں گھر جانا چاہتی ہوں۔"

"ذرا ناشتہ کر لو، میں ڈرائیور سے کہوں گا وہ تمھیں پہنچا آئے گا، کہاں رہتے ہو تم لوگ؟"

"چندر نگر، جہاں تھانیدار صاحب اور ان کا تھانہ ہے۔"

"کیا نام ہے تمھارا؟"

"حسینہ، حسینہ بیگم۔"

"حسینہ! تم حسین ہو، تمھاری ماں نے تمھارا نام چن کر رکھا ہے، وہ بڑھیا تمھاری ماں ہے نا؟"

"نہیں سرکار، وہ میری دادی ہے۔ میری ماں مجھے جنم دے کر چل بسی تھی۔"

"کتنی عمر ہے تمھاری؟"

"پتہ نہیں، یہی کوئی سولہ، سترہ، اٹھارہ ہی ہے۔ میں ماں کے پیٹ سے پڑھ کے نہیں آئی۔ میں اپنے جنم دن کا حساب نہیں رکھ سکی" اتنا کہہ کر وہ اپنے اس معمولی سے مذاق پر خود ہی ہنس دی۔ ویسے وہ خوش تھی کہ سرکار خود اس میں اور اس کے خاندان میں دلچسپی لے رہے ہیں۔

بیرے نے ناشتہ لاکر رکھ دیا، لڑکی نے اٹھ کر چائے کا کپ تیار کیا اور ٹوسٹ کو مکھن وغیرہ لگایا، یہ سب کچھ اس نے لے جاکر حکم چند کی میز پر اس کے سامنے رکھ دیا۔

"میں کچھ نہیں لوں گا، میں نے ابھی چائے پی ہے" حکم چند نے کہا۔

"اگر آپ کچھ نہیں لیتے، تو میں بھی نہیں لوں گی" لڑکی نے نزاکت سے کہا اور ہاتھ میں تھامی چھوری وغیرہ رکھ کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔

ڈپٹی صاحب خوش ہو گئے "تم مجھ سے ناراض مت ہو" انھوں نے لڑکی کے پاس جاکر اس کے شانوں پر ہاتھ دھر کر کہا "تمھیں کچھ کھانا چاہیے۔ تم نے کل رات بھی کچھ نہیں کھایا تھا"

"اگر آپ کھائیں گے تو میں کھاؤں گی، اگر آپ نہیں کھائیں گے تو میں بھی نہیں کھاؤں گی" لڑکی نے شانے جھٹک کر کہا۔

"اچھا، تمھاری خوشی، چلو دونوں کھاتے ہیں" ڈپٹی صاحب نے اس کے ساتھ چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

لڑکی نے ایک ٹوسٹ کے دونوں طرف اور چاروں کناروں پر مکھن لگا کر ڈپٹی صاحب سے منہ کھولنے کو کہا اور پورا ٹوسٹ ایک ہی بار میں ان کے منہ میں ٹھونس دیا۔ جب ڈپٹی صاحب نے اپنے بھرے ہوئے منہ سے "بس" "بس" کی دہائی دی تو لڑکی ہنس پڑی اور پھر اس نے اپنے ہاتھ سے ڈپٹی صاحب کی مونچھوں پر لگا مکھن پونچھ دیا۔

"تم اس پیشے میں کب سے آئی ہو؟" ڈپٹی صاحب نے پوچھا۔

"کیسی معصومیت کی باتیں پوچھتے ہیں! کیوں، جب سے میں پیدا ہوئی ہوں، میری ماں طوائف تھی، اس کی ماں بھی طوائف تھی اور اس کی ماں بھی۔۔۔"

"میں گانے کی بابت نہیں کہہ رہا ہوں، دوسری چیز" ڈپٹی صاحب نے نگاہ چرا کر کہا۔

"دوسری چیز کا کیا مطلب؟ ہم پیسے کی خاطر دوسری چیزیں نہیں کرتے۔ میں گاتی ہوں اور ناچتی ہوں۔ میرا خیال ہے آپ ناچ گانے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ آپ صرف دوسری چیزوں کے بارے میں جانتے ہیں۔ وسکی کی بوتل اور دوسری چیزیں اور بس، ہوں" لڑکی ذرا تیزی سے بولی۔

ڈپٹی صاحب نے ذرا گھبراہٹ کے عالم میں کھنکار کر گلا صاف کیا اور کہا۔

"نہیں، مگر میں نے تو کچھ نہیں کیا۔"

لڑکی ہنس پڑی اور ڈپٹی صاحب کے چہرے پر ہاتھ دھر کر کہنے لگی "بے چارے ڈپٹی صاحب! آپ کی نیت تھی لیکن آپ تھکے ہوئے تھے، گاڑی کے انجن جیسے تو خراٹے لیتے رہے آپ"۔ اور پھر لڑکی خراٹوں کی نقل اتارتے ہوئے ہنس دی۔ ڈپٹی صاحب کو کل دن لاشوں بھری گاڑی یاد آگئی، وہ گاڑی کے بارے میں سوچتے رہے اور پھر انھوں نے حسینہ کا نام دو تین بار دوہرایا جیسے یاد کر رہے ہوں "حسینہ" انھوں نے پھر کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے، میرا نام حسینہ ہے، کہیئے کیا کہتے ہیں؟"

"حسینہ، تم لوگ مسلمان ہو؟" انھوں نے کہا۔

"ہاں، میں مسلمان ہوں، اور حسینہ بیگم کیا ہو سکتی تھی؟ داڑھی والا سکھ؟"

"میرا خیال ہے چندر نگر کے مسلمان نکال دیے گئے ہیں۔ تم لوگ ابھی تک کیسے رہ رہے ہو؟"

"بہت سے چلے گئے ہیں، لیکن تھانے دار صاحب کہنے لگے کہ ہم رہ سکتے ہیں جب تک کہ ہمیں کوئی جانے کے لیے نہ کہے۔ اس لیے کہ گانے بجانے والے نہ ہندو ہوتے ہیں نہ مسلمان، ساری ذاتوں کے لوگ میرا گانا سننے کے لیے آتے ہیں۔"

"اچھا اور مسلمان لوگ بھی چندر نگر میں ہیں؟"

"ہاں، ہیں، آپ انھیں ہندو، مسلم، سکھ، ثریا وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتے، ایک بچھوں

کاؤنڈا ابھی تک ہے" لڑکی شرماسی گئی۔

"لیکن ان فسادات کے دنوں میں آپ کو ہوشیار ہو کر رہنا چاہیے۔ کچھ دنوں کے لیے آپ لوگوں کو باہر نہیں نکلنا چاہیے" ڈپٹی صاحب نے ہمدردی کے جذبے سے کہا۔

"میں نہیں ڈرتی" ڈرکیا؛ اتنے بڑے آدمی بھی اتنی اچھی طرح جانتے ہیں اور پھر اتنے بڑے ڈپٹی صاحب کی چھتر چھایا کے نیچے کسی میں اتنی جرأت نہیں کہ ہمارا بال بھی بیکا کر سکے" لڑکی نے ایک شریر سی مسکان کے ساتھ ڈپٹی صاحب کی طرف دیکھا اور پوچھا،

"آپ چاہتے ہیں میں پاکستان چلی جاؤں؟"

حکم چند نے لڑکی کو اپنی گرفت میں دبوچ کر بھینچ لیا۔ انھیں جیسے حرارت سی ہو رہی تھی، "حسینہ" انھوں نے دوبارہ کھنکارا۔

"حسینہ" لیکن ان کو الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

"حسینہ، حسینہ، حسینہ میں کوئی بہری تو نہیں، کہیے، کیا کہتے ہیں؟"

"تم رات یہیں رہو گی، ٹھیک ہے نا؛ تم ابھی تو نہیں جانا چاہتی ہونا؟"

"بس، یہی کہنا تھا؛ اگر آپ اپنی کار نہیں دیں تو میں پانچ میل تک بارش میں بھیگتی ہوئی تو نہیں جاسکوں گی۔ لیکن اگر آپ مجھ سے گانا سننے لگے اور ایک رات مزید مجھے یہاں رکھیں گے تو آپ کو نوٹوں کی ایک بڑی گڈی مجھے اور دینا ہوگی۔"

"ایک گڈی، میں تم پر سے سو گڈیاں وار دوں" ڈپٹی صاحب نے سکھ کا سانس لیتے ہوئے کہا "میں تم پر اپنی جان تک قربان کر دینے کو تیار ہوں۔" انھوں نے دل بڑا کر کے حسینہ کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

حوالات میں ایک ہفتہ تک جگے کو یہی معلوم نہ ہو سکا کہ اس کے ساتھ والی کوٹھری میں بھی کوئی ملزم یا حوالاتی بند ہے۔ دو چار دن تک جگے کو ہر شام، پولیس والے بند کوٹھری میں سے باہر لے جاتے اور ایک دو گھنٹے باہر رکھنے کے بعد واپس چھوڑ جاتے اور

ایک دن جب وہ باہر سے واپس آرہا تھا تو اس نے دیکھا کہ اس کی برابر والی کوٹھری میں ایک تعلیم یافتہ بابو بیٹھا اخبار پڑھ رہا ہے۔ اس دن بارش ہو کر تھمی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کمرے میں تاریکی سی چھائی محسوس ہوئی تھی۔ اس لیے برابر والی کوٹھری کا اقامت گزیں بابو مجبور ہو کر سلاخوں کے بالکل قریب آکر باہر کی روشنی کی مدد سے اخبار پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ شاید پہلے بھی اسی کوٹھری میں ہوا کرتا تھا، لیکن اس سے پہلے وہ اوٹ میں ہو کر پڑھا کرتا تھا اسی باعث جگا اسے نہ دیکھ سکا تھا۔ کنکھیوں سے جگے نے دیکھا کہ اس کی کوٹھری جگے کی کوٹھری کی نسبت بڑی اور صاف تھی جگے کو اس امتیاز سے ذرا سا بھی دکھ نہ ہوا کیوں کہ وہ اتنا محسوس کر سکتا تھا کہ پڑھے لکھے آدمی کو جتنی رعایت اصولاً ملنی چاہیے یہ تو اس سے بھی کم ہی تھی، بلکہ اسے ایک طرح سے یہ سوچ کر خوشی ہوئی کہ وہ ایک تعلیم یافتہ آدمی کے پڑوس میں قید ہے اور یہ کہ پڑھے لکھے بابو بھی ملزم ہو سکتے ہیں؟ اس نے بابو کے معصوم اور بے گناہ چہرے کو دیکھا اور بابو کو سنا کر ایک سپاہی سے کہنے لگا "اس بے چارے بابو جی کو کیوں لے آئے ہو، سو تو سنا دو۔"

اخبار پڑھنے میں معروف قیدی کو اس سے زیادہ کچھ سنائی نہ دیا۔ لیکن اسے اس بات کا بڑا دکھ ہوا کہ وہ ایک بدمعاش کے رحم کا نشانہ بن رہا ہے۔ اس نے اخبار ایک طرف پھینک دیا اور جگے کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس نے جگے کو کوٹھری میں بند ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے جگے کو متواتر تین چار روز تک پولیس کے پہرے میں باہر جاتے اور واپس آتے دیکھا تھا جس پر اس نے تھانیدار سے جگے کی بدمعاشیوں، اس کی آشنائیوں اور گرفتاری کے اسباب کے بارے میں بھی جاننے کی کوشش کی تھی۔ اسے جگے کے ساتھ تھوڑی سی ہمدردی بھی تھی اور اسے جگے پر رحم بھی آتا تھا اور وہی جگا اب بابو کے لیے اظہارِ ترحم کر رہا تھا۔

اور پھر اس نے اپنے بارے میں سوچنا شروع کر دیا کہ کس طرح وہ ڈکیتی والی صبح کو ایک سماج سدھارک کی حیثیت میں آکر منوماجرا کے گوردوارے میں قیام پذیر ہوا تھا اور جب گوردوارے کے بھائی کو اس نے اپنا نام اقبال بتایا تو بھائی جی نے اس کے ترشے

ہوئے بالوں کے باوجود اسے اقبال سنگھ جی کہہ کر مخاطب کیا تھا اور کس طرح پولیس والے اسے بلا وجہ رام لال کے مقدمۂ قتل میں گرفتار کر کے لے آئے تھے اور کس طرح انھوں نے اس پر مسلم لیگ کا کارندہ ہونے کا الزام لگا کر حوالات میں بند کر دیا تھا۔

اس کی ان سوچوں کے دوران جگّا اپنی کوٹھری میں پہنچ چکا تھا۔ پھر بابو جگّے کی طرف کنکھیوں سے دیکھتا رہا۔ عین اس سمے اس نے دیکھا کہ پانچ آدمی ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑے اس کی کوٹھری میں لائے جا رہے ہیں۔ جگّا انھیں دیکھتے ہی غصّے میں بھر گیا۔ اس نے انھیں گالیاں دینا شروع کر دیں۔ اقبال کو یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کون تھے ان کی باتوں اور غل غپاڑے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ لوٹ مار کرنے والے لوگ ہیں وہ ان لوگوں کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ایک سپاہی نے اقبال کی کوٹھری کا دروازہ کھولا اور جگّے کو اندر لے آیا۔ اقبال کو جگّے کی طرف دیکھ کر عجیب سا احساس ہوا لیکن جگّے کو اقبال کی قربت سے بڑی خوشی ہوئی تھی۔

"ست سری اکال بابو جی" اس نے ہنس کر کہا "میں آپ کے قدموں کا غلام ہوں آج سے میں کچھ سیکھنے کی کوشش کروں گا۔"

"اقبال صاحب" سپاہی نے کوٹھری کو دوبارہ تالا لگاتے ہوئے کہا "اس بدمعاش کو سیدھے راستے پر چلنے کا طریقہ بتایئے گا۔"

"تم جا کر کام کرو اپنا" جگّا بولا "بابو جی کے اندازے کے مطابق تو مجھے تم نے اور تمھاری سرکار نے ہی بدمعاش بنایا ہے" اس نے چندر نگر کے ایک کتاب خواں کے الفاظ دوہراتے ہوئے کہا۔ اور اقبال سے اس کی تصدیق چاہی "ٹھیک یہی بات ہے نا بابو جی؟"

اقبال نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر اسٹول پر پاؤں ٹکائے کاغذوں کے ڈھیر کو تکنے لگا۔ جگّے نے اقبال کے پاؤں اسٹول سے اٹھا کر ہاتھوں میں لے لیے اور دابنے لگا بولا "میری بھی قسمت جاگ پڑی ہے آخر میں آپ کا یہ احسان کبھی فراموش نہ کروں گا، اگر آپ مجھے انگریزی پڑھا دیں۔ بس دو چار الفاظ جن میں گٹ مٹ کر سکوں۔"

"تمھاری والی کوٹھری میں کون آ رہا ہے" اقبال نے بات کو ٹالنے کے لیے کہا۔

"مجھے علم نہیں" جگّے نے اقبال کے پاؤں دابتے ہوئے ذرا جھجک کر جواب دیا کہنے

ہیں، رام لال کے قاتل ہیں۔"

"میرا خیال تھا کہ انھوں نے تمھیں بھی قتل کیس میں ہی گرفتار کیا ہے۔"

"ہاں مجھے بھی۔" بھگے نے سونے کی میخوں والے دانت کر کے مسکراتے ہوئے کہا۔

"منوا جرامیا پیٹ بھی کھڑکے تو یہ مجھے پکڑ لیتے ہیں، میں بدمعاش ہوں نا۔"

"تو تم نے رام لال کو قتل نہیں کیا؟"

"توبہ، توبہ" بھگے نے اقبال کے پاؤں چھوڑ کر اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا "اپنے گاؤں کے بنیے کا قتل، بابوجی، کبھی سونے کے انڈے دینے والی مرغی کو بھی مارا ہے کسی نے۔ یوں بھی رام لال تو میرا شاہ تھا۔ میں نے اسی سے روپے کر وکیلوں کو دیے تھے جب میرا باپ جیل میں تھا۔ میں نمک حرامی نہیں کر سکتا۔"

"تو میرا خیال ہے یہ تمھیں تو چھوڑ دیں گے۔"

"پولیس راج ہے، جو چاہے کرے، اگر مجھے رکھنا چاہیں تو کسی بھی بہانے رکھ سکتے ہیں، میرے پاس بے لائسنس برچھا کیوں ہے، یا میں رات کو گھر سے باہر کیوں نکلا تھا یا پھر کوئی اور ایسی ہی بات۔"

"لیکن تم تو اس دن گاؤں میں ہی نہیں تھے، ہے نا؟"

"میں گاؤں میں نہیں تھا بابوجی" بھگے نے اقبال کے پاؤں اپنی رانوں کے درمیان رکھ کر شرارتی آنکھوں سے اس کو دیکھتے ہوئے کہا "میں کسی کو قتل نہیں کر رہا تھا، میں تو خود قتل ہو رہا تھا۔"

اقبال سمجھ گیا کہ وہ نوراں سے اپنے معاشقے کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اس نے بھگے کے بارے میں ایک ایک تفصیل جان لی تھی۔ اس تھانے میں اسے بھگے کے سوا کوئی دوسرا آدمی ہی نظر نہ آیا تھا، جس میں وہ دلچسپی لے سکتا۔ لیکن وہ بھگے کے ساتھ نوراں کے بارے میں کوئی بات کر کے اسے بلاوجہ اپنے اوپر سوار نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"آپ تو عرصہ رہے ہو گے ولایت میں۔" بھگے نے آہستہ سے پوچھا۔

"ہاں کئی برس" اقبال نے بھگے کو ٹالنے کے لیے اپنا منہ گھما کر کہا۔

"پھر تو بابوجی، آپ بہت سی میموں کے ساتھ سوئے ہوں گے وہاں؟" جگے نے اور بھی رازداری کے انداز میں سرگوشی کی "واہ واہ واہ، بابوجی مہاراج، میمیں تو حوریں ہوتی ہیں جنت کی، گوری، ملائم، ریشم جیسی۔"

"چلو چھوڑو ان باتوں کو، عورتوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔" اقبال نے جگے کے ہاتھوں سے اپنے پاؤں چھڑاتے ہوئے کہا "تم شادی شدہ نہیں ہو جگے؟"

"نہیں بابوجی، کون دیتا ہے اپنی بیٹی میرے جیسے بدمعاش کو؟ زندہ رہے ہماری محبوبہ، ہمیں شادی سے کیا لینا ہے۔"

"اچھا تو تم کسی سے محبت بھی کرتے ہو؟"

"عشق ہی تو مجھے اس کوٹھری میں لایا ہے، یوں اگر میں اس رات پھر ملاقات نہ جاتا تو میں آپ کی زیارت کیسے کرپاتا بابوجی؟ مجھے انگریزی کون سکھاتا؟ سکھاؤ نا مجھے تھوڑی اِٹ مِٹ، سکھاؤ گے نا بابوجی؟"

"انگریزی کا کیا کرو گے تم؟ میمیں تو چلی گئی ہیں۔ تم نے اگر سیکھنی ہے تو اپنی زبان سیکھو۔"

جگے کو یہ تجویز کوئی خاص پسند نہ آسکی۔ اس کے لیے پڑھائی کا مطلب صرف انگریزی جاننا تھا۔ دفتروں کے بابو اردو، گورمکھی کے عرضی نویس کوئی پڑھے لکھے تھوڑا کہلاتے تھے۔

"اپنی زبان تو میں کسی سے بھی سیکھ سکتا ہوں بابوجی۔ بھائی ست سنگھ نے بہت زمانہ پہلے مجھے گورمکھی سکھانے کا وعدہ کیا تھا لیکن گورمکھی بھی کوئی تعلیم ہے بھلا، آپ کہاں تک پڑھے ہو بابوجی، میٹرک پاس ہوں گے آپ تو؟"

"ہاں میں دسویں پاس ہوں، اصل میں میں نے سولہ جماعتیں پڑھی ہیں۔"

"سولہ؟ بلے بلے! مجھے تو کوئی نہیں ملا سولہ پاس آج تک۔ ہمارے گاؤں میں تو رام لال نے ہی چار جماعتیں پاس کی تھیں۔ اب وہ بھی مرچکا۔ اگر کوئی تھوڑا بہت لکھ پڑھ سکتا ہے تو وہ بھائی ست سنگھ ہی ہے۔ پڑوس کے کسی گاؤں میں تو کوئی بھائی بھی

نہیں. ہمارے تھانیدار صاحب سات جماعت پاس ہیں اور ڈپٹی صاحب دس، سو کتنا بڑا دماغ ہوگا آپ کا تو۔"

اقبال اس قدر پرجوش مدح سرائی سے زچ سا ہو گیا" کچھ تو لکھ پڑھ لیتے ہوگے تم بھی۔" اس نے کہا۔

"میں، میں نے کیا پڑھنا تھا؟ میرے چچازاد بھائی نے سنایا تھا ایک گیت مجھ کو یہ پنجابی اور انگریزی کا مرکب تھا۔

پجن کبوتر، اڑن فلائی
ٹک، دیکھو آسمان سکائی

آپ کو آتا ہے یہ؟"

"نہیں، مجھے تو نہیں آتا یہ، تمھیں اس نے انگریزی کی ابجد نہیں سکھائی؟"

"کون سی؟ اے بی سی تو خود اسے بھی اتنی ہی آتی تھی، میرے جیتی!

اے بی سی، کتنے گئی سی
لاٹ صاحب مر گیا مکانے گئی سی

"یہ تو آتا ہوگا، آپ کو؟"

"نہیں، مجھے تو یہ بھی نہیں آتا۔"

"اچھا، آپ مجھے تھوڑی سی انگریزی سکھا دیں۔"

اقبال کو مانتے ہی بنی۔ اس نے جگا کو صبح کی ملاقات پر "گڈ مارننگ" اور شام کو رخصت ہوتے وقت گڈ نائٹ کہنا سکھایا اور جب جگے نے جنسی اعضا کی انگریزی پوچھنا چاہی تو اقبال کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ عین اسی لمحے پانچ نئے ملزم لاکر برابر والی کوٹھری میں بند کر دیے گئے جگے کی ساری سرمستی کافور ہو گئی اور اقبال کی جان بھی چھوٹ گئی۔

گیارہ بجے تک، گرجتی چنگھاڑتی بارش، ہلکی ہلکی رم جھم میں بدل گئی۔ دن پر نکھار آ گیا۔ تھانیدار نے پیڈل مارتے بند کرکے آسمان کی طرف دیکھا۔ اس کے سامنے تھوڑے فاصلے پر بادل چھٹ گئے تھے اور صاف شفاف نیلا آسمان دکھائی دینے لگا تھا۔ سورج کی

شعاعیں بارش کا سینہ چیرتی زمین پر گر رہی تھیں اور قرمزی رنگ کے ملبوس میں پانیوں سے لت پت کھیتوں میں محوِ رقص تھیں۔ آسمان پر دو علیحدہ علیحدہ سمتوں میں دھنکوں نے اپنے رنگ بکھیر دیے تھے اور اُن میں سے رنگوں کی ایک قوس نے چندرنگر کے قصبے پر اپنا ہفت رنگ آنچل پھیلایا ہوا تھا۔

تھانیدار نے سائیکل کی رفتار اور بھی بڑھادی، وہ روزنامچے میں ملّھی اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں کسی اندراج سے بیشتر تھانے پہنچ جانا چاہتا تھا۔ بعد میں اوراق پھاڑنے کی بنا پر کئی پیچیدگیاں جنم لے سکتی تھیں۔ وکیلوں کے نہ جانے کتنے ہی اُلٹے سیدھے سوالوں کے جواب دینے پڑتے تھے۔ اسے حوالدار پر بہت بھروسہ تھا لیکن بگّے اور اقبال کی گرفتاری کے بعد یہ بھروسہ ٹوٹ گیا تھا۔ تھانیدار کو اندیشہ لاحق تھا کہ وہ خاص مقدمات کو ٹھیک طرح سے نبھانے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اُسے معلوم ہی نہیں تھا کہ کسے قیدیوں کو کہاں رکھنا ہے، وہ تو بالکل اجڈ ہے پڑھے لکھے لوگوں سے خوفزدہ ہو کر رہتا ہے۔ اسے اقبال کو چھیڑنے کا حوصلہ ہی نہیں ہوگا کیوں کہ اسی خوف کے باعث اس نے اس کی کوٹھڑی میں چارپائی اور میز کرسی بھی رکھوادی تھی اور اگر اس نے ملّھی کے ساتھیوں کو بگّے والی کوٹھڑی ہی میں بند کر دیا تو وہ آپس میں صلاح و مشورہ کر کے مقدمے کو اپنی ضرورت کے مطابق بنا لیں گے۔

جونہی اس کی سائیکل تھانے کے احاطے میں داخل ہوئی تو برآمدے میں بیٹھے کچھ سپاہیوں نے اٹھ کر اس کا خیر مقدم کیا۔ ایک نے اس کی سائیکل تھام لی، دوسرے نے اسے اپنی برساتی تلے پناہ دے کر بارشوں میں باہر جانے کی مجبوری کے بارے میں بڑبڑا کر تھانیدار سے اپنی ہمدردی کا اظہار کیا۔

"ڈیوٹی" تھانیدار نے باوقار لہجے میں جواب دیا "ڈیوٹی میں بارش کیا، اگر حشر بھی اُٹھ کھڑا ہو تو ڈیوٹی پہلے، حوالدار ابھی واپس نہیں آیا؟"

"آگیا ہے جناب! وہ ابھی ابھی ملّھی اور اس کے ساتھیوں کو لے کر آیا ہے اور ابھی چاد پینے کے لیے اپنے کوارٹر کی طرف گیا ہے۔"

"اس نے روزنامچے میں کوئی اندراج تو نہیں کیا؟"

"نہیں جناب! وہ کہتا تھا کہ آپ کی آمد کے بغیر اندراج نہیں ہوگا۔"
تھانیدار خوش ہوگیا، وہ رپورٹنگ روم میں چلا گیا، اس نے اپنی پگڑی اتار کر ایک کھونٹی پر لٹکا دی اور خود کرسی کی پشت سے ٹیک گیا۔ میز پر رجسٹری رجسٹر پڑے تھے۔ ایک زرد صفحات والا بہت ہی ضخیم رجسٹر اس کے سامنے اندراج کے لیے کھلا پڑا تھا۔ اس نے آخری اندراج پر نظر ڈالی۔ یہ اس کے اپنے ہاتھوں کا تحریر تھی صبح صبح منوماجرا کے ڈاک بنگلے روانگی کا اندراج۔
"شاباش" اس نے اپنے ہاتھوں کا مساج کرتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔
اس نے اپنی رانوں پر ہاتھ مارے اور اپنی پیشانی پر بکھرے بالوں کو انگلیوں سے سنوارا۔ "درست" اس نے اونچی آواز میں کہا "بالکل ٹھیک" ایک سپاہی نے بڑی عجلت میں چار کا ایک گلاس لاکر اس کو تھماتے ہوئے کہا "آپ کے کپڑے گیلے ہوں گے؟"
"تم لوگوں نے ملی کو جگے والی کوٹھری میں تو بند نہیں کر دیا؟"
تھانیدار نے چار کے گلاس کو چھوئے بغیر سپاہی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
"توبہ توبہ" سپاہی نے اپنے کانوں کی لوؤں کو چھوا۔ "تھانے میں خون ہو جاتا جناب! اس وقت آپ یہاں ہوتے جب ہم ملی کو لے کر آئے تو دیکھتے۔ جگا تو اسے دیکھتے ہی پاگل ہوگیا تھا۔ میں نے اس طرح کی باتیں نہیں سنیں کبھی۔ اس نے تو ملی کو ماں، بیٹی اور بہن کی ناقابل بیان گالیاں دیں۔ اس نے تو کوٹھری کی سلاخیں اکھاڑ دینی تھیں۔ ایک ہی کمرے میں بند کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ملی تو اس کی کوٹھری میں یوں چپ چاپ داخل ہو جاتا جیسے کوئی میمنا کسی شیر کے پنجرے میں سہما ہوا سا داخل ہو۔"
"تو ملی نے جواب نہیں دیا جگے کو؟" تھانیدار نے مسکرا کر پوچھا۔
"نہیں جی، وہ تو بہت خوف زدہ ہوگیا تھا۔ یہی کہہ رہا تھا کہ اس کا ڈکیتی میں کوئی ہاتھ نہیں۔ جگا تو اسے کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا اور کہہ رہا تھا کہ اس نے ملی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور کہہ رہا تھا کہ جیل سے رہا ہونے کے بعد سب کی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کا قرمن مباک کرے گا۔ پھر ملی نے اسے، جو ہے کی بیٹی کا عاشق کہہ کر چڑھایا تھا، اس

وقت آپ بگّے کو دیکھتے تو وہ وحشی بن گیا تھا بالکل۔ اس کی آنکھوں سے آگ برسنے لگی۔ اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر بھبکیاں جگھاریں۔ اس نے اپنا سینہ ٹھونکا اور جیل کی سلاخیں ہلا کر قسم کھائی کہ وہ ملہی کے پرزے اُڑا دے گا۔ میں نے کبھی کسی کو اتنے تاؤ میں سلگتے نہیں دیکھا۔ اس لیے ہم ملہی کو اس وقت تک رپورٹنگ روم سے باہر نہیں لے گئے جب تک کہ بگّے کے غصے کا چڑھتا طوفان اتر نہیں گیا۔ پھر کہیں ہم نے بگّے کو بابو والی کوٹھری میں منتقل کیا۔ اور ملہی اور اس کے ساتھیوں کو بگّے والی کوٹھری میں لے جا کر بند کیا۔"

"پھر تو یہاں بڑا تماشہ ہوا ہوگا" تھانیدار نے دانت نکال کر کہا "چلو اور کرتے ہیں یہ تماشہ۔ میں ملہی وغیرہ کو رہا کرنے لگا ہوں۔"

سپاہی تھانیدار کی بات سمجھ نہیں سکا۔ لیکن اس کے استفسار سے پہلے تھانیدار نے لاٹ صاحب کے انداز میں ہاتھ کا اشارہ کر کے اسے خاموش کر دیا "تم نہیں جانتے کارروائی کیا ہوتی ہے، سیکھ جاؤ گے جب میری ملازمت کے برابر سال گنوا لو گے تو، جاؤ دیکھو، حوالدار نے چارج ختم کر لی ہے یا نہیں۔ اسے کہو جلدی آئے۔۔۔۔"

تھوڑی دیر بعد حوالدار بھی ڈکاریں لیتا ہوا آ گیا۔ وہ اپنے طور پر اپنی کارگزاری پر بہت خوش تھا۔ تھانیدار نے اس کی اس خوشی اور مسکراہٹ کو نظر انداز کر کے اسے دروازے کی کنڈی لگا کر بیٹھ جانے کو کہا۔ اس کی یہ خوشی تھانیدار کی طرف توجہ میں بدل گئی۔ وہ کنڈی لگا کر تھانیدار کی میز کے پہلو میں آ کر کھڑا ہو گیا "فرمایئے کیا حکم ہے جناب کا؟" اس نے پوچھا

"ذرا دم لو، بیٹھ جاؤ، کوئی جلدی نہیں" تھانیدار کی گفتگو میں عجلت نہیں تھی۔

حوالدار بیٹھ گیا۔

تھانیدار نے پنسل کے ترشے ہوئے سرے کو اپنے کان میں گھما کر نکالا اور پنسل سے لگی میل کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنی جیب میں سے ایک سگرٹ نکالی اور کتنی ہی دیر تک اس کے سرے کو ماچس سے ٹکراتا رہا اور پھر اسے سلگا کر زور زور کے کش لینے لگا۔ اس کے نتھنوں سے نکلتا دھواں میز سے ٹکرا کر کمرے میں پھیل رہا تھا۔

"ہیڈ کانسٹیبل صاحب!" اس نے اپنی زبان پر لگے تمباکو کو پونچھ کر کہا "ہیڈ

کانسٹبل صاحب! آج بہت سے کام کرنے والے ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ وہ سبھی آپ ہی کے ہاتھوں سے انجام پائیں۔"

"فرمائیے جناب!" حوالدار نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

"نمبر ایک، ملبی اور اس کے ٹولے کو منوماجرا چھوڑ آؤ، انھیں کسی ایسی جگہ جاکر چھوڑو جہاں گاؤں کے لوگ انھیں رہا ہوتے دیکھ سکیں — کہیں گوردوارے کے آس پاس، اور نمبر دو! گاؤں والوں سے یونہی سوال کرو کہ کسی نے سلطانہ اور اس کے گروہ کے لوگوں کو تو نہیں دیکھا کہیں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں۔ صرف پوچھ تاچھ ہی کرنی ہے۔ بس۔"

"لیکن جناب، سلطانہ اور اس کا ٹولہ تو پاکستان جا چکا ہے، سبھی جانتے ہیں۔"

تھانیدار نے ایک بار پھر کان میں پنسل کا سرا گھما کر نکالا اور پنسل کو میز سے پونچھ دیا۔ پھر اس نے سگرٹ کے دو چار کش لیے اور اپنے ہونٹ سکوڑ کر دھواں کچھ اس طرح باہر نکالا کہ مرغولہ رجسٹر سے ٹکرا کر حوالدار کے چہرے پر پھیل گیا۔ "میں نہیں جانتا، سلطانہ پاکستان گیا ہے یا نہیں۔" اس نے کہنا شروع کیا "وہ ڈاکے کے بعد سے منوماجرا میں دکھائی نہیں دیا تو گاؤں والوں سے پوچھنے میں مضائقہ کیا ہے؟ خواہ وہ جانتے ہی کیوں نہ ہوں، ٹھیک ہے۔"

"میں سمجھ گیا، جناب" حوالدار نے پوری طرح بات کو سمجھے بغیر ہی کہہ دیا — اس اُمید پر کہ کچھ دیر میں وہ پوری اسکیم کو سمجھ جائے گا۔ "آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی حضور۔"

"بس ایک بات اور" تھانیدار نے میز پر سے اُٹھتے ہوئے کہا "ایک سپاہی کو بھجوا دینا جو مجھ سے مسلمان ریفیوجی کیمپ کے کمانڈر کے نام ایک خط لے جائے اور ساتھ ہی کل صبح جب پاکستانی فوجی مسلمانوں کو لے جانے کے لیے منوماجرا آئیں تو مجھے کچھ سپاہی بھجوانے کی ضرورت یاد دلا دینا۔"

حوالدار سمجھ گیا کہ تھانیدار نے آخری بات اس لیے کہی ہے کہ حوالدار اس اسکیم کو نہ سمجھ سکے۔ اس نے اس ساری بات چیت کو ذہن نشین کر لیا اور دوسری بار سلیوٹ مارنے کے بعد "اچھا جناب" کہہ کر چلا گیا۔

تھانیدار نے پگڑی اپنے سر پر جمائی۔ وہ دروازے میں کھڑے ہو کر تھانے کے صحن کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے سامنے والی دیوار پر چڑھی ہوئی بیل بارش سے دھل گئی تھی۔ اس کے پتے چمک رہے تھے۔ بائیں جانب سپاہیوں کی بیرک میں چارپائیوں کی قطاریں لگی تھیں اور ایک ایک چارپائی پر تہ کیے ہوئے بستر رکھے تھے۔ بیرک کے بالمقابل تھانے کی حوالات کی دو کوٹھڑیاں واقع تھیں۔ یہ معمولی قسم کے کمرے تھے۔ بس اتنا ہی فرق تھا کہ ان کی اگلی دیوار اینٹوں کے بجائے سلاخوں کی تھی۔ ان کے ذریعے پورے آنگن سے کوٹھڑیوں کی ایک ایک چیز دکھائی دیتی تھی۔ پہلے کمرے میں اقبال کرسی پر بیٹھا ایک رسالہ پڑھ رہا تھا اس نے اپنے پاؤں چارپائی کے کنارے پر جمائے ہوئے تھے، فرش پر اخبار بکھرے پڑے تھے۔ جگا سلاخیں تھام کر خالی خالی بیٹھا نظروں سے پولیس کے کوارٹروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دوسری کوٹھڑی میں ملہی اور اس کے ساتھی فرش پر لیٹے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ جب حوالدار اور اس کے ساتھ چار سپاہی ہتھکڑیاں لے کر آئے تو وہ چاروں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ جگّے نے پولیس کو ساتھ والے کمرے کی طرف جاتے دیکھ کر کسی شک کا اظہار نہ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ملہی کو کچہری میں پیش کرنے کی غرض سے لینے آئے ہیں۔

ملہی نے جگّے کے غصے کو دیکھ لیا تھا، وہ ڈر کے مارے جگّے سے راضی نامہ لکھوانے پر تیار تھا لیکن جگّے کی گالیاں سن کر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ یوں بھی وہ جگّے کی دشنام طرازیوں کو نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنے گروہ کے اراکین کی نظروں میں جگّے کے مقابلے میں چھوٹا نظر نہیں آنا چاہتا تھا۔ اس نے جی ہی جی میں ایک فیصلہ کیا کہ وہ جگّے پر پھبتیاں کسے گا اور اپنے گروہ کی نظر میں بلند ہونے کے لیے اینٹ کا جواب پتھر سے دے گا۔ ذرا موقع تو بہم ہو۔ اب لوہے کی سلاخیں اس کا بس نہیں چلنے دے رہی تھیں۔ مسلح سپاہی بھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو رہے تھے۔

سپاہیوں نے آ کر ملہی اور اس کے ٹولے کو ہتھکڑیاں لگا دیں اور یہ سبھی ہتھکڑیاں حوالدار کی پیٹی سے لگی بڑی زنجیر سے جوڑ دی گئیں۔ حوالدار انھیں لے کر آگے آگے چل پڑا اور دو بندوق بردار سپاہی ان کے پیچھے پیچھے ہولیے۔ جگّے نے ان کو کوٹھڑی میں سے نکلتے دیکھ کر

یک بار ملہی پر نظر ڈالی اور پھر اپنا چہرہ دوسری جانب پھیر لیا۔

"تم نے پرانے دوستوں کو بھلا دیا ہے جگے" ملہی نے دوستانہ رقابت کے لہجے میں کہا" تم ہماری طرف دیکھتے بھی نہیں اور ہم تمھاری جدائی میں تڑپ رہے ہیں"

"جانے دو یار، چھوڑو بے چارے کو" اس کے ساتھیوں نے ہنس کر کہا۔

جگا ابھی تک اپنی نظریں زمین پر جمائے ہوئے تھا۔

"تم اس قدر ناراض کیوں ہو میرے یار، اتنے اداس کیوں ہو؟ کسی محبوبہ کی یاد تو نہیں آرہی؟"

"آجاؤ، آجاؤ۔ چلتے آؤ" حوالدار نے دبی آواز میں کہا، پولیس والے محظوظ ہو رہے تھے۔

"کیوں؟ ہم اپنے پرانے یار کو ست سری اکال نہیں کہہ سکتے؟ ست سری اکال، سردار جگت سنگھ جی! کوئی پیغام تو نہیں بھیجا آپ نے؟ کوئی محبت کا پیغام — جولاہوں کی بیٹی کے نام"

جگا سلاخوں میں سے اس طرح گھورتا رہا جیسے وہ کچھ بھی نہ سن رہا ہو، غصے میں اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ اس نے ہاتھوں کی گرفت میں لوہے کی سلاخوں پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔

ملہی نے اپنے مسکراتے ہوئے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا — "سردار جگت سنگھ جی آج علیل ہیں، وہ ہمارے 'ست سری اکال' کا جواب بھی نہیں دے سکے، چلو نہ سہی ہم ایک بار اور ست سری اکال کہہ دیتے ہیں انھیں"

ملہی اپنے ہتھکڑیوں میں جکڑے ہاتھوں کو جوڑ کر جگے کی سلاخوں کے قریب جھک کر اونچی آواز میں کہنے لگا "ست سری ....."

جگے نے سلاخوں میں سے جھپٹ کر ملہی کو اس کی پگڑی کے نیچے گردن پر پھیلے ہوئے بالوں کی لٹوں سے گرفت میں لے لیا۔ ملہی کی پگڑی نیچے گر گئی۔ جگے نے ایک زوردار جھٹکا مارا جیسے وہ بیری کے پیڑ سے بیر گرا رہا ہو۔ وہ ملہی کا سر سلاخوں سے ٹکرا کر ہر

جھٹکے کے ساتھ ایک گالی الاپتا۔ یہ تمھاری ماں کے۔۔۔۔ یہ تمھاری بہن کے۔۔۔۔ یہ تمھاری بیٹی کے۔۔۔۔ یہ پھر تمھاری ماں کے۔۔۔۔ یہ پھر تمھاری بہن کے اور یہ۔۔۔"

اقبال جو اب تک یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا ایک گوشے میں کھڑے ہو کر سپاہیوں سے بولا "تم چھڑاتے کیوں نہیں نہیں، تمھیں نظر نہیں آتا کہ یہ اس کو ختم ہی کر ڈالے گا۔"

سپاہیوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ ایک نے اپنی بندوق کا دستہ جگے کے چہرے کی طرف بڑھایا لیکن جگا نہ ٹلا۔ ملہی کا سر لہولہان ہو گیا تھا اس کی کھوپڑی اور پیشانی جگہ جگہ سے زخمی ہو گئیں۔ وہ چیخنے لگا تھا۔ تھانیدار نے جگے کے ہاتھوں پر کئی ہنٹر مارے، لیکن جگا پھر بھی اسے چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔ تھانیدار نے اپنا پستول جگے پر تان کر کہا۔ "چھوڑ دے اس کو سور نہیں تو میں۔۔۔"

جگے نے ملہی کا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس کے منہ پر تھوک دیا اور پھر ایک بھاری بھرکم گالی دے کر اسے پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔ جب ملہی گرا تو اس کے بال اس کے چہرے اور شانوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ وہ بچوں کی طرح رو رہا تھا "تمھاری ماں کی موت آئے ۔۔ سور کا بچہ نہ ہو تو۔۔۔۔ میں بھی بتاؤں گا تمھیں۔"

سپاہی ملہی اور اس کے ساتھیوں کو لے گئے۔ بہت دیر تک ملہی کے رونے اور گالیاں دینے کی آواز تھانے میں سنائی دیتی رہی۔ اقبال ابھی تک تیز تیز لہجے میں کچھ بولے چلا جا رہا تھا۔ جگے نے غصے میں آ کر پیچھے دیکھا اور بولا "تم چپ رہو بابو، میں نے تمھارا کیا بگاڑا ہے کہ تم یونہی بولے چلے جا رہے ہو، جلا رہے ہو؟"

جگے نے کبھی اقبال سے اتنے تند لہجے میں بات نہیں کی تھی جگے کے لہجے میں تلخی دیکھ کر اقبال اور بھی بھڑک گیا "تھانیدار صاحب! اب تو دوسری کوٹھری خالی ہو گئی ہے۔ مجھے وہاں کیوں نہیں بھیج دیتے؟" اس نے مطالبہ کیا۔

تھانیدار نفرت کے سے انداز میں مسکرا کر بولا "ضرور ضرور اقبال صاحب ہم آپ کے آرام کے لیے سب کچھ کریں گے۔ میز کرسیاں اور بجلی کے پنکھے بھی؟"

جب گاؤں والوں کو پتہ چلا کہ گاڑی لاشوں سے پٹی آئی تھی تو سارے گاؤں پر چپ کا آسیب طاری ہو گیا۔ سب اپنے اپنے دروازوں میں کھڑے ہو گئے اور رات بھر ایک دوسرے سے کھسر پھسر کرتے اور چھتوں پر ہی سو رہے۔ ہر ایک کسی نہ کسی سہارے کو تلاش کرنے لگا۔ کسی نے تاروں کو بادلوں کے آنچل میں چھپتے نہ دیکھا اور کسی کو مینہ برسانے والی ٹھنڈی ہوا کا احساس بھی نہ ہو سکا۔ جب وہ صبح کو بیدار ہوئے تو انھوں نے دیکھا کہ بارش ہو رہی ہے۔ سب سے پہلے ان کی توجہ گاڑی کی طرف گئی اور گاڑی سے ہٹ کر جلتی ہوئی لاشوں کی طرف۔ سارے اپنے اپنے گھروں کی چھتوں پر چڑھ کر ایک بار پھر اسٹیشن کی طرف دیکھنے لگے۔

گاڑی اسی طرح چپ چاپ رخصت ہو گئی جس طرح چپ چاپ آ کھڑی ہوئی تھی۔ اسٹیشن سنسان نظر آتا تھا۔ سپاہی لوگوں کے خیمے پانی میں بھیگ کر ماتمی سا منظر پیش کرنے لگے تھے۔ کہیں آگ جلتی نہیں نظر آتی تھی اور کسی جانب سے دھواں اٹھتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اصل میں زندگی یا موت کا کوئی بھی روپ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لوگ پھر بھی تکے جا رہے تھے۔ شاید کوئی اور گاڑی اور زیادہ لاشیں لے کر آنے والی تھی۔

دن ڈھلے تک سارے بادل مغرب کی جانب تیر گئے۔ بارش ہونے کی بنا پر نکھار آ گیا تھا اور میلوں تک صاف دکھائی دیتا تھا۔ سبھی اپنے گھروں سے نکل کر ایک دوسرے سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش میں لگے تھے۔ گھوم پھر کر سبھی اپنے گھروں کی چھتوں پر آ چڑھے۔ اگرچہ بارش بند ہو چکی تھی۔ پھر بھی ریلوے پلیٹ فارم، مسافر خانے یا فوجی کیمپ میں کوئی آدمی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اسٹیشن کے پہلو میں کچھ گدھ قطاریں باندھ کر بیٹھے ہوئے تھے اور ان سے بہت بلندی پر کچھ دائروں میں پرواز کرتے دکھائی دے رہے تھے۔

گاؤں سے بہت دور باہر کی طرف پولیس کچھ ملزموں کو لے کر آتی دکھائی دی جس کسی نے بھی انھیں دیکھا، آواز دے کر دوسروں کو مطلع کر دیا۔ گاؤں والوں نے نمبردار کو گوردوارے کے پیپل تلے بلوا بھیجا تھا۔ جب حوالدار صاحب اور سپاہی ملزموں کو لے کر منو ماجرا

پہنچے تو پیپل کے نیچے بہت سے اہل منوماجرا اکٹھے ہو چکے تھے۔
حوالدار نے گاؤں والوں کے پاس لے جا کر ملزموں کی ہتھکڑیاں کھول دیں۔ ان سے کاغذوں پر انگوٹھے لگوائے اور انھیں حکم دیا کہ وہ ہفتے میں دوبار تھانے اطلاع دیا کریں۔
گاؤں والے حیران ہو کر دیکھتے رہے وہ جانتے تھے کہ جگے اور اقبال کا ڈکیتی میں کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ انھیں یقین تھا کہ پولیس نے ملی کے گروہ کو گرفتار کر کے صحیح سمت میں قدم اٹھایا تھا شاید یہ سب کے سب واردات میں شریک نہ ہوں' انھوں نے سوچنا شروع کیا۔ کسی ایک کو غلطی سے گرفتار کر لیا ہوگا لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ ان میں سے کوئی ایک بھی اس واردات میں شریک نہ ہوا ہو۔ لیکن پولیس انھیں رہا کر چکی تھی۔ اور وہ بھی اُن کے اپنے گاؤں میں نہیں بلکہ منوماجرا میں' جہاں انھوں نے قتل کیا تھا۔ پولیس کو اُن کے حق میں کوئی نہ کوئی ثبوت ضرور مل گیا ہوگا ورنہ وہ انھیں ہرگز نہ رہا کرتی۔ گاؤں کے لوگ حیران تھے۔
حوالدار نے نمبردار کو ایک طرف لے جا کر کچھ کہا اور پھر دونوں ایک دوسرے سے بات چیت کرتے رہے۔ نمبردار نے واپس اجتماع کی طرف لوٹ کر گاؤں والوں سے پوچھا" حوالدار صاحب پوچھ رہے ہیں کہ کسی نے سلطانہ بدمعاش اور اُس کے ٹولے کے بارے میں کوئی اطلاع ہے"۔
بہت سے لوگ بیک آواز بولے کہ وہ تو اپنے گروہ کے افراد سمیت پاکستان جا چکا ہے۔ وہ بھی مسلمان تھے اور ان کے گاؤں سے سبھی مسلمان نکال دیے گئے ہیں۔
" وہ شاہ کے قتل سے پہلے گئے تھے یا بعد میں؟" حوالدار نے نمبردار کے قریب ہو کر پوچھا۔
"بعد میں" گاؤں والے بیک آواز بولے۔ پھر کچھ دیر تک سبھی چپ رہے۔ گاؤں والے ایک دوسرے کی طرف ذرا پریشان ہو کر دیکھنے لگے۔ انھوں نے ڈالا تھا کہ؟ وہ یہ سوال حوالدار سے پوچھنا ہی چاہتے تھے کہ حوالدار نے پھر بولنا شروع کر دیا" تم میں سے کسی نے اس مسلم لیگی بابو محمد اقبال سے بات کی ہے؟"
نمبردار کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اقبال مسلمان ہے۔ اسے یاد آرہا تھا کہ امام بخش اور بھائی ست سنگھ اسے اقبال سنگھ کہہ کر بلاتے تھے۔ اس نے لوگوں کے درمیان امام بخش کو تلاش کرنا چاہا لیکن وہ کہیں نہیں تھا۔ کئی گاؤں والے آگے بڑھ بڑھ کر حوالدار کو بتانے

لگے کہ انھوں نے اقبال کو ریل کے پل کی جانب کھیتوں میں گھومتے دیکھا تھا۔

"تمھیں اس پر شک ہوا تھا؟"

"شک؟ ہو... ..."

"تمھیں اس کے بارے میں کسی چیز نے مشکوک کیا تھا؟"

"تمھیں؟"

کسی کو بھی یقین نہیں تھا۔ پڑھے لکھے لوگوں پر کسی کو بھی یقین نہیں آتا تھا۔ وہ بھی بہت ہوشیار ہوتے ہیں۔ فقط ایک ست سنگھ تھا جس سے بابو کے بارے میں سوالات کیے جا سکتے تھے۔ ابھی تک بابو کی کچھ چیزیں بھائی کے گوردوارے میں پڑی تھیں۔ گاؤں والوں نے ست سنگھ کو آگے کر دیا۔

حوالدار نے ست سنگھ کو نظر انداز کرتے ہوئے پھر انہی لوگوں سے سوال کیا جو جواب دے رہے تھے۔ "میں بھائی سے بعد میں بات کروں گا، کیا آپ لوگوں میں سے کوئی بتا سکتا ہے کہ یہ ماجرا میں ڈکیتی کی واردات سے پہلے آیا تھا یا بعد میں؟"

یہ بھی حیران کن بات تھی۔ ایک شہری بابو نے ڈکیتی یا قتل کی واردات سے کیا لینا تھا؟ ہو سکتا ہے وہ ملوث ہی ہو۔ خون فقط پیسے کے لیے ہی نہیں ہوا تھا، کسی کو پورا یقین نہیں تھا۔ حوالدار نے لوگوں کو یہ کہہ کر برخاست کر دیا "اگر کسی کو شاہ کے قتل، سلطانہ یا محمد اقبال کے بارے میں کوئی درست اطلاع ملے تو تھانے میں رپورٹ درج کرائے۔"

سبھی لوگ ایک دوسرے سے اونچی آواز میں بات چیت اور اشارے کرنے لگے۔ ست سنگھ حوالدار کے پاس چلا گیا۔ جو اپنے سپاہیوں کو واپس لے جانے کے لیے تیار کر رہا تھا۔ "سنتری صاحب" اس نے کہا۔

"جس بابو کو آپ گرفتار کر کے لے گئے تھے وہ مسلمان نہیں تھا، سکھ تھا، اقبال سنگھ۔" حوالدار نے اس کی بات کو نظر انداز کر دیا۔ وہ زرد رنگ کے کاغذوں پر کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ ست سنگھ صبر کے ساتھ انتظار کرتا رہا۔

"سنتری صاحب" اس نے حوالدار کو کاغذ تہ کرتے دیکھ کر کہا لیکن حوالدار نے اس

پر نظر ہی نہیں ڈالی۔ اس نے ایک سپاہی کو بلا کر کاغذ اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا "کوئی سائیکل یا مانگ لے کر تم یہ چھٹی پاکستانی فوجی یونٹ کے کمانڈر کو دے آؤ۔ کہنا میں منو ماجرا سے آیا ہوں وہاں حالات خطرناک ہیں۔ وہ اپنے ٹرک اور سپاہی منو ماجرا کو خالی کرنے کے لیے فوراً بھجوا دیں۔"

"اچھا جناب" سپاہی نے سیلوٹ مار کر کہا۔

"سنتری صاحب! سنتری صاحب، سنتری صاحب" حوالدار نے بھڑک کر کہا۔ "میرے کان کھا لیے ہیں تمھارے سنتری صاحب نے۔ کیا چاہیے تمھیں؟"

"میں نے عرض کرنی تھی جناب کہ اقبال سنگھ سکھ ہے۔"

"تم نے اسے برہنہ کر کے دیکھا تھا کہ سکھ ہے یا مسلمان؟ تم تو نرے جاہل ہو گوردوارے کے۔ جا، جا کے پاٹھ کر۔"

حوالدار سپاہیوں کو "ایباؤٹ ٹرن" کر کے لے گیا اور ست سنگھ گوردوارے کی سمت چلا گیا، گاؤں والوں کے عجلت میں پوچھے گئے سوالوں کا جواب دیے بغیر۔

منو ماجرا میں حوالدار کا پھیرا لگنے کے ساتھ گاؤں دو دھڑوں میں بٹ گیا۔ بالکل اسی طرح جیسے مکھن کی ٹکیہ کو چاقو سے دو ٹکڑوں میں بانٹ دیا جائے۔

مسلمان اُداس ہو کر اپنے گھروں میں جا دبکے۔ انھیں پٹیالے، انبالے اور کپور تھلے کے سکھوں کے، وہاں کے مسلمانوں پر کیے گئے مظالم کی بھولی بسری خبریں پھر سے تازہ دم ہو کر یاد آنے لگیں۔ انھوں نے شریف عورتوں کے برقعے بازار میں اتارے جانے کی خبریں سنی تھیں۔ انھیں سرِ بازار برہنہ کر کے مارچ کرانے اور اُن کے ساتھ دن دہاڑے زنا بالجبر کرنے کی خبریں بھی سنی تھیں۔ کئی عورتوں نے اپنی عزتیں بچانے کی خاطر خودکشی کر لی تھی۔ انھوں نے سنا تھا کہ مسجدوں میں سور کاٹے گئے تھے اور قرآن کے اوراق پھاڑے گئے تھے۔ یہ سب کچھ یاد آتے ہی انھیں منو ماجرا کا ہر سکھ زہر کا کٹورا لیے پھرتا دکھائی دینے لگا۔ انھیں سکھوں کی صورتوں میں وحشی ناچتے دکھائی دینے لگے۔ پہلی بار انھیں احساس ہوا کہ پاکستان ان کے لیے کیا تھا۔ سہارے کے لیے بنی پناہ گاہ جہاں کوئی سکھ نہیں تھا۔

سکھ یوں بھی زچ ہو کر غصے سے بھرے بیٹھے تھے "کبھی کسی مسلمان پر اعتبار نہ کرو" وہ دشمنی پتا گورو گوبند سنگھ کے حوالے دے کر کہتے، گورو ارجن دیو کے تپتے ہوئے توؤں کا تذکرہ کرتے۔ گورو تیغ بہادر کا سر قلم ہونے کی کہانی کہتے، گورو گوبند سنگھ پر کیے گئے خفیہ وار کا ذکر ہوتا۔ اور ان کے چاروں صاحبزادوں کے بنیادوں میں چنوائے جانے کا واقعہ بیان کر کے اورنگ زیب کی ہندوؤں کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کے بارے میں سوچنے لگ جاتے کہ کس طرح وہ سوا من جنیو اتارے بغیر کھانا نہیں کھاتا تھا۔ کس طرح اذیتیں دے دے کر انھیں اسلام قبول کرنے پر مجبور کرتا تھا اور کس طرح اس کے جانشینوں نے سکھ مت کی بے عزتی کی تھی کس طرح انھوں نے گوردواروں میں گاؤکشی کی اور کس طرح انھوں نے شری گورو گرنتھ صاحب کے اوراق پرزہ پرزہ کر دیے تھے۔ انھوں نے ہندو اور سکھ عورتوں کی بے حرمتی کی تھی۔ سکھ شرنارتھیوں نے ان عورتوں کے قصے کہے تھے جو مسلمانوں کے ہاتھ لگنے سے پہلے جل کر یا ڈوب کر مر گئی تھیں اور جو زندہ بچ گئی تھیں انھیں برہنہ کر کے جلوس نکالے گئے اور ان کی بے حرمتی کر کے انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، اب اہل منو ماجرا نے دیکھا تھا کہ سکھوں کی لاشوں سے بھری ہوئی گاڑی کو ان کے اپنے گاؤں میں جلایا گیا تھا۔ رام لال قتل کر دیا گیا تھا، خواہ یہ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ قاتل کون ہے لیکن اس قدر سبھی جانتے تھے کہ رام لال ہندو تھا اور سلطان اور اس کا گروہ مسلمان۔ اور ایک کٹے بالوں والا اجنبی شخص گاؤں کی سرحدوں میں گھومتا رہا تھا۔

کسی کے ساتھ بر سر جنگ ہونے کے لیے یہ اسباب کافی تھے۔ منو ماجرا کے سکھوں نے وہاں کے مسلمانوں سے مقابلہ کی ٹھان لی۔ ان کے اندازے اور قیاس کے مطابق مسلمان بالکل احسان فراموش تھے۔ سکھ کبھی استدلال کی پیروی نہیں کرتے۔ اگر جوش میں آ جائیں تو استدلال کیسر بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

وہ رات گھپ اندھیری تھی، جو ہوا بادلوں کو ہانک کر لے گئی تھی، وہی انھیں واپس لے آئی تھی، پہلے یہ بادل سفیدا ون کے گالے سے بن کر آئے، چاند نے ان کو اپنے منہ سے جھٹک دیا تھا۔ اور پھر یہ ابر لہروں کے روپ میں آئے اور چاند کو پورے کا پورا ڈھانپ لیا، آسمان دھندلا سا گیا تھا۔ چاند نے ان بادلوں سے بھی اپنا راستہ تلاش لیا تھا۔ دور کہیں آسمانی

پر چاندی سی چمکنے لگی۔ پھر یہ بادل سیاہ ہیبت ناک گھٹاؤں کے روپ میں امڈ کر سارے آسمان پر اپنی اجارہ داری قائم کر بیٹھے اور پھر بجلی چمکانے لگی۔ پھر بارش نے اپنا سرگم چھیڑ دیا۔

تھوڑے سے سکھ جاٹ، نمبردار کے ہاں اکٹھے ہو گئے۔ ایک لال ٹین کے اطراف میں جہاں کسی کو جگہ ملی جم گیا۔ کوئی چارپائی پر، کوئی مونڈھے پر، کوئی پیڑھی پر اور باقی لوگ فرش پر بیٹھ گئے۔ بھائی ست سنگھ بھی ان میں شامل تھا۔

کتنی ہی دیر کوئی کچھ نہ بولا سوائے اس کے "رب ہمیں ہمارے گناہوں کی سزا دے رہا ہے۔"

"ہاں، رب ہمیں اپنے گناہوں کی سزا دے رہا ہے۔"

"پاکستان میں بڑا ظلم ہو رہا ہے۔"

"اس لیے کہ رب ہمیں ہمارے گناہوں کی سزا دے رہا ہے، برے کاموں کے برے نتیجے۔"

اور پھر ایک نوجوان بولا "کیوں ہم نے ایسے کون سے گناہ کیے ہیں، ہم نے مسلمانوں کو اپنے بھائیوں اور بہنوں کی طرح رکھا ہے۔ وہ ہمارے پاس جاسوس کیوں بھیجتے ہیں۔"

"تمھارا مطلب ہے اقبال" بھائی بولا "میں نے اس سے بہت باتیں کی تھیں۔ اس نے لوہے کا کڑا پہن رکھا تھا۔ وہ کڑا اسے اس کی ماں نے ڈالا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا۔ وہ صحیح دھاری سکھ ہے۔ وہ تمباکو بھی نہیں پیتا۔ یوں بھی وہ شاہ کے اگلے روز یہاں آیا تھا۔"

"بھائی! تم بہت جلدی باتوں میں آ جاتے ہو۔" اس نوجوان نے جواب دیا "اگر مسلمان گھڑی دو گھڑی کے لیے کڑا پہن لے یا وہ تمباکو نہ پیے تو اس سے وہ مر تو نہیں جاتا ـــــ جب سراغرسانی کرنی ہو تو آدمی کیا نہیں کرتا؟"

"میں سیدھا سادہ بھائی ہو سکتا ہوں لیکن یہ بات تم بھی جانتے ہو اور میں بھی کہ اس کا قتل کی واردات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو واردات کے بعد وہ گاؤں میں نہ رہتا۔ یہ تو نادان سے نادان آدمی بھی اندازہ لگا سکتا ہے۔"

نوجوان قدرے خفیف ہو کر رہ گیا۔

"اس کے علاوہ" بھائی بولتا گیا "انھوں نے قتل کے الزام میں ملہی اور اس کے گروہ کو پکڑ ہی لیا ہے ...."

"تمھیں کس نے بتایا ہے کہ ملہی وغیرہ کو اسی جرم کے تحت گرفتار کیا گیا ہے" نوجوان نے بہت تندی سے پوچھا۔

"ہاں، تم پولیس کی کارروائیوں کو کیا جانو؟ پولیس نے تو ملہی کو بری کر دیا ہے۔ کبھی قاتلوں کو بنا گواہی اور تفتیش کے بری ہوتے ہوئے دیکھا ہے تم نے" کوئی اور بولا۔

"بھائی جی، تم ہم سے بے سرو پا بات کرتے ہو۔"

"اچھا، اگر تم اتنے ہی باخبر ہو تو بتاؤ کہ بھگے کے گھر میں چڑیاں کس نے پھنکوائی تھیں۔" بھائی نے پوچھا۔

"ہم کیا جانیں۔" سبھی نے بیک آواز کہا

"میں بتاتا ہوں، یہ بھگے کا دشمن ملہی ہی تھا۔ تم سب جانتے ہو کہ وہ آپس میں لڑے ہوئے ہیں، اس کے علاوہ کسی اور میں اتنا دم تھا کہ وہ بھگے کی بے عزتی کرتا اس طرح؟"

اس بار کوئی نہ بولا۔ بھائی اپنی دلیل کو مزید واضح کرنے کے لیے اور بھی زور سے بولنے لگا "اور یہ سلطانہ، سلطانہ سب بکواس ہے۔ اس کا ڈکیتی سے کیا تعلق؟"

"ہاں بھائی جی، آپ درست کہتے ہوں گے۔" ایک اور نوجوان بولا "لالہ ست مر گیا، اب اس جھگڑے کو ختم کرو، پولیس خود ہی نمٹ لے گی۔ جگا ملہی اور سلطانہ جانے اور ان کا کام۔ جہاں تک بابو کا تعلق ہے، وہ گیا جہنم میں۔ ہمیں تو سوچنا یہ ہے کہ ہم ان سوروں کا کیا کریں جو ہمارے درمیان موجود ہیں؟ یہ نسلوں سے ہمارا نمک کھا رہے ہیں، اب دیکھو ہمارے ساتھ ان کی بھلائی ــــ ہم انھیں بھائی بناتے رہے اور یہ زہریلے سانپ نکلے۔"

اہلِ محفل کا پارہ چڑھ گیا۔

ست سنگھ نے غصے میں آ کر کہا "کیا بگاڑا ہے انھوں نے تمھارا؟ تمھاری زمین چھین لی ہے، تمھارے گھروں پر قبضہ کر لیا ہے یا تمھارے گھروں میں آ گھسے ہیں؟ بولو کیا کیا ہے انھوں نے؟"

"شرنارتھیوں سے پوچھو، کیا کیا ہے ان کے ساتھ انھوں نے" وہی نوجوان پھر بولا جس نے بات شروع کی تھی "تمھارا خیال ہے کہ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ گوردوارے جلائے گئے ہیں اور ان گنت آدمی مارے گئے ہیں وہ جھوٹ بولتے ہیں۔"

"میں منو ماجرا کی بات کر رہا ہوں، کیا کیا ہے ہمارے مزارعین نے ہمیں؟"

"وہ مُسلے ہیں۔"

ست رسنگھ نے اپنے شانے جھٹکائے۔

نمبردار نے سوچا کہ وہی اس بحث کو ختم کر سکتا ہے۔ "جو ہونا تھا سو ہو چکا" اس نے دانش مندی کی بات کی۔ "ہم یہ سوچیں کہ اب ہم نے کیا کرنا ہے۔ یہ ریفیوجی جو آکر گوردوارے میں مقیم ہوئے ہیں یہ کوئی واردات ضرور کریں گے جس سے گاؤں کی بدنامی ہوگی۔"

"واردات" کے لفظ نے سب کو چوکنا کر دیا۔ یہ اجنبی لوگ گاؤں میں کیا واردات کر سکتے ہیں؟ ایک بار پورا گاؤں پھر سے متحد ہو گیا۔ "ہم دیکھ لیں گے۔ ہمارے جیتے جی، جو ہمارے مزارعین کی طرف انگلی بھی اٹھائے گا۔" اسی نوجوان نے پرجوش لہجے میں کہا جو ابھی ابھی ان کو سور بتا رہا تھا۔

نمبردار نے اسے خاموش کرا دیا "تمھیں کچھ زیادہ ہی جوش آتا ہے کبھی تم مسلمانوں کو مارنے پر تلے نظر آتے ہو اور کبھی ریفیوجیوں کو۔ ہم کچھ اور کہتے ہیں، تم کوئی اور مطلب نکال لیتے ہو؟"

"اچھا، اچھا نمبردارا!" نوجوان نے اپنی بے عزتی کی گرد جھاڑتے ہوئے کہا۔ "اگر تم اتنے ہی عقل مند ہو تو کہو جو کہنا چاہتے ہو؟"

"سنو بھائیو!" نمبردار نے اپنی آواز دھیمی کر کے کہا "یہ طیش میں آنے کا وقت نہیں۔ یہاں کوئی کسی کو مارنا نہیں چاہتا۔ لیکن کسی کی نیت کو کون پڑھ سکتا ہے۔ آج یہاں چالیس پچاس کے قریب ریفیوجی ہیں جو گورو کی مہربانی سے بہت اچھے لوگ ہیں۔ کل کلاں اور آجاتے ہیں جن پر پاکستان میں ظلم ٹوٹے ہوں، کیا ہم انھیں اپنے گاؤں میں آنے سے

روک سکیں گے۔ اور اگر وہ آہی جائیں تو کیا ہم برداشت کریں گے کہ وہ اپنا غصہ ہمارے مزارعوں پر اتاریں؟"

"تم نے بہت اصول بات کی ہے نمبردار!" ایک بوڑھا بولا۔ "ہمیں اس بارے میں سوچنا چاہیے۔"

جاٹ اپنے بارے میں جانتے تھے ـــــ وہ کسی بے گھر کو پناہ دیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے اور اپنے مسلمانوں کو جانے کے لیے بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ اپنے گاؤں والوں کے ساتھ ظلم انھیں گائے کا گوشت کھانے جیسا بڑا گناہ لگتا۔ اوپر اوپر سے کوئی لاکھ کہتا، دل کسی کا نہیں چاہتا تھا کہ وہ انھیں گاؤں سے رخصت کردیں۔ وہ سچ مچ ایک الجھن کا شکار تھے۔

اور پھر کچھ دیر بعد نمبردار بولا "آس پاس کے سارے گاؤں کے مسلمان چندر نگر کے کیمپ میں بھیج دیے گئے ہیں۔ بہت سے براہ راست پاکستان چلے گئے ہیں اور کئی جالندھر کے بڑے کیمپ میں بھجوا دیے گئے ہیں۔"

"ہاں" ایک بولا "کپورا اور جگو مٹھو بھی گزشتہ ہفتے خالی ہو گئے ہیں۔ ایک منو ماجرا ہی ہے جس نے مسلمانوں کو رکھ چھوڑا ہے۔ یہ معلوم کرو کہ انھوں نے اپنے گاؤں کے مسلمانوں کو کیا کہہ کر رخصت کیا ہے۔ ہم اپنے مزارعوں سے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ منو ماجرا خالی کردو۔ یہ تو اپنے بیٹوں کو گھروں سے بے دخل کرنے والی بات ہے، ہے کوئی ایسا جوان سے کہہ سکے: بھائیو! تمھیں منو ماجرا سے چلے جانا چاہیے۔"

ابھی کسی سے کوئی جواب وضع نہیں ہو پایا تھا کہ ایک اور شخص آکر دہلیزوں پر کھڑا ہو گیا۔ سب نے منہ پیچھے موڑ کر دیکھا لیکن نیم تاریکی میں اسے کوئی نہ پہچان سکا۔

"کون ہے؟" نمبردار نے لالٹین سے چہرا اٹھا کر کہا "آؤ اندر آجاؤ۔"

امام بخش اندر آ گیا۔ اُن کے پیچھے دو آدمی اور تھے، وہ بھی مسلمان تھے۔

"سلام، چاچا امام بخش، سلام، خیر دینا، سلام، سلام۔"

"ست سری اکال نمبردار" "ست سری اکال" مسلمانوں نے جواب دیا۔

لوگوں نے ان کے لیے جگہ خالی کردی اور سبھی امام بخش کی جانب منہ کرکے بیٹھ گئے۔

امام بخش نے اپنی خارنگ داڑھی میں انگلیوں سے شانہ کرتے ہوئے کہا "ہاں، بھائیو! کیا فیصلہ کیا ہے تم نے ہمارے بارے میں؟"

وہاں ایک عجیب سی خاموشی گھل گئی۔ سب نمبردار کی طرف دیکھنے لگے۔

"ہم سے کیا پوچھتے ہو؟" نمبردار بولا "سنو! جیسا ہمارا ویسا تمھارا بھی اس پر اتنا ہی حق ہے جتنا ہمارا"

"لیکن آپ لوگوں نے سن ہی لیا کہ لوگ کیا کہتے ہیں۔ اطراف کے سارے گاؤں خالی کرا لیے گئے ہیں۔ بس ہم ہی رہ گئے ہیں۔ اگر آپ لوگ کہیں تو ہم بھی چلے جاتے ہیں۔"

بھائی ست سنگھ بڑبڑانے لگا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اب اسے نہیں بولنا چاہیے اسے جو کہنا تھا وہ کہہ چکا تھا، یوں بھی وہ گرہستی ہی تھا جو بل جائے اس پر شکر گزار ہونے والا۔ اور پھر ایک نوجوان جس کی مسیں بھیگ رہی تھیں بولا "بات یوں ہے چاچا امام بخش! جب تک ہم اس گاؤں میں ہیں کسی میں دم نہیں کہ وہ آپ لوگوں سے کچھ بھی کہے۔ پہلے ہم ریں گے اور پھر تم لوگ اپنے آپ کو سنبھال لینا۔"

"ہاں" ایک اور نوجوان اسی گرم جوشی سے بولا "پہلے ہم اور بعد میں تم۔ کوئی آپ کی طرف میلی آنکھ سے بھی دیکھے تو ہم اس کی ماں کی......

"ماں، بہن، بیٹی ...... بات ہی کیا ہے" باقی سب بول پڑے۔

امام بخش نے اپنی پگڑی کا پلو اپنی آنکھوں پر پھیرا اور کرتے کے دامن سے ناک صاف کی "ہم نے پاکستان سے کیا لینا ہے۔ ہم نے یہاں جنم لیا ہے، ہمارے اجداد یہیں پیدا ہوئے تھے، ہم آپ کے ساتھ بھائیوں کی طرح رہتے ہیں" وہ روہانسا ہو گیا۔ بھائی ست سنگھ نے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا اور خود بھی رونے لگا اور بھی لوگ اندر ہی اندر روئے اور پھر دھاڑیں مارنے لگے۔

اور پھر ہمت کر کے نمبردار بولا "ہاں، آپ ہمارے بھائی ہو، جب تک آپ کا جی چاہے، آپ کے بیٹے، آپ کے پوتے یہاں رہیں۔ اگر کسی نے آپ کی بہن یا بیٹی کی طرف میلی آنکھ سے دیکھا تو وہ ہم سے بھر پائے گا۔ ہم دیکھیں گے اگر کوئی آپ کا بال بھی بیکا کرے لیکن چاچا ہم کتنے لوگ ہیں۔ پاکستان سے آنے والے ریفیوجی ہزاروں ہیں۔ ان کی ذمہ داری کون لے سکتا ہے؟"

"ہاں" سبھی ہاں میں ہاں ملاتے گئے "جہاں تک ہمارا تعلق ہے آپ کا کچھ نہیں بگڑے گا لیکن اُن ریفیوجیوں کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے؟ ہم نے سُنا ہے کہ گاؤں والوں سے بیس بیس گنا زیادہ لوگ بندوقیں' چھُریاں اور برچھیاں لے کر آوارد ہوتے ہیں جنھیں روکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"ہم ان سے نہیں ڈرتے۔" کسی دوسرے نے بڑی تیزی سے جواب دیا۔ "آنے دو اُن کو ایسی دُھنائی کریں گے کہ پھر کبھی منوماجرا کا نام نہیں لیں گے۔"

اس نوجوان کی شیخی کی طرف کوئی متوجہ نہ ہوا۔

امام بخش نے ایک بار پھر ناک صاف کی' "تو پھر آپ لوگ کیا مشورہ دیتے ہیں ہیں؟" بات کرتے کرتے اس پر پھر رقت طاری ہو گئی تھی۔

"چاچا" نمبردار نے بھاری آواز میں کہا "میرا کہنے کو جی نہیں چاہتا لیکن وقت کی رفتار دیکھ کر میں تو یہی مشورہ دوں گا کہ آپ اتنی دیر کے لیے کیمپ میں ہی چلے جائیں جب تک یہ معاملہ ٹھنڈا نہیں پڑ جاتا۔ اپنے گھروں کو تالے لگا جاؤ۔ آپ کے مویشیوں کو ہم اس وقت تک اپنی نگرانی میں رکھیں گے جب تک آپ واپس نہیں آجاتے۔"

نمبردار کی بات سن کر خاموشی اور بھی سوا ہو گئی۔ کوئی سانس تک نہیں لیتا تھا کہ کوئی سن نہ لے۔ نمبردار خود ہی یہ بات کہہ کر' اس کے اثر کو زائل کرنے کے لیے اب کچھ اور کہنا چاہتا تھا "کل تک تو" اس نے اونچی آواز میں کہنا شروع کیا۔ "کوئی اور وقت ہوتا تو ہم آپ کو گھاٹ کے پایاب سے پار پہنچا دیتے لیکن اب دو دنوں سے بارش ہونے کے سبب دریا کی سطح بلند ہو گئی ہے۔ اب راستے ریل اور سڑک کے پلوں پر ہی کھلے ہیں اور وہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ آپ دیکھ چکے ہیں۔ ہم تو یہی مشورہ دیں گے کہ آپ کچھ دنوں کے لیے کیمپ میں چلے جائیں اور جہاں تک ہمارا تعلق ہے" اس نے تیزی سے دوہرایا۔ "اگر آپ رہنا چاہیں تو سر آنکھوں پر' ہم آپ کے لیے اپنی جانیں تک قربان کر دیں گے۔"

نمبردار کا کہا سب کی طرف سے مشترکہ رائے تھا۔ یہ سب کے دلوں کی آواز تھی۔ وہ سب اپنی نگاہیں جھکائے بیٹھے رہے تا آں کہ امام بخش اٹھ کھڑا ہوا۔

"ٹھیک ہے" اس نے پورے تیقن سے کہا "اگر ہم نے جانا ہی ہے تو ہم ابھی باندھتے ہیں اپنا سامان، اپنے باپ دادا کے گھروں کو خالی کرنے کے لیے ہمیں پوری رات درکار ہوگی۔"

نمبردار کو یونہی ایک گناہ کا احساس ہونے لگا تھا۔ اس کا دل بھر آیا۔ اس نے اٹھ کر امام بخش کو گلے لگا لیا اور دھاڑیں مار کر رونے لگا اور بھی سبھی سکھ اور مسلمان ایک دوسرے کی بانہوں میں کھو کر بچوں کی طرح رونے لگے اور پھر آہستہ آہستہ امام بخش، نمبردار کے سینے سے علیحدہ ہو کر بولا "ہمیں رونا نہیں چاہیے، زمانے کا دستور ہی کچھ ایسا ہے۔

سدا نہ باگیں بلبل بولے
تے سدا نہ موج بہاراں
سدا نہ ماپے حسن جوانی
سدا نہ مجلس یاراں"

"ہاں دستور ہی چلا آ رہا ہے" کئی لوگوں نے سسکتے ہوئے کہا "چاچا امام بخش، زندگی ہے ہی ایسا۔"

امام بخش اور اس کے ساتھی آنسو بہاتے چلے گئے۔

دوسرے مسلمانوں کو اطلاع دینے سے پہلے امام بخش مسجد سے ملحق اپنے ڈھارے میں گیا۔ نوراں سو چکی تھی۔ تاب دان پر رکھا مٹی کا چراغ روشن تھا۔ "نورو! نورو" اس نے نوراں کو شانوں سے جھنجھوڑ کر جگایا "اٹھ آنکھیں کھول۔"

"کیا بات ہے" لڑکی نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

"اٹھ اپنا سامان باندھ لے، ہم چلے جائیں گے کل صبح کے وقت۔"

"چلے جانا ہے؟ کہاں؟"

"معلوم نہیں ... پاکستان۔"

"ہیں" لڑکی نے ہڑبڑا کر اٹھتے ہوئے کہا "میں نہیں جاتی پاکستان۔"

"سب کپڑے ٹرنک میں ڈال لو، اور برتن بوری میں" امام بخش نے بیٹی کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا "بھینس کے لیے کچھ لے لیا، یہ بھی لے جانی پڑے گی۔"

"مجھے پاکستان نہیں جانا" لڑکی نے جوش میں آکر کہا۔

"تم جاؤ، نہ جاؤ، وہ تمھیں خود ہی نکال دیں گے۔ سارے مسلمان کیمپ کو جا رہے ہیں کل۔"

"کون نکالے گا ہمیں؟ یہ ہمارا گاؤں ہے، پولیس اور سرکار مر تو نہیں گئی؟"

"نادانی نہیں کرتے لڑکی، جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔ لاکھوں ہزاروں لوگ جا رہے ہیں۔ پاکستان کی طرف، اور لاکھوں آ رہے ہیں۔ جو نہیں جائیں گے وہ مارے جائیں گے، جلدی کر، تیار ہو جا۔ میں نے اوروں سے بھی کہا ہے تیار ہونے کے لیے۔"

امام بخش لڑکی کو چارپائی پر بیٹھے چھوڑ کر چلا گیا۔ نوراں نے اپنی آنکھیں ملیں اور دیوار کی طرف دیکھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کیا کرے۔ اس نے سوچا وہ گھر سے چلی جائے اور جب صبح کو سب لوگ چلے جائیں تو وہ گھر کو لوٹ آئے۔ لیکن وہ اکیلی کیسے جا سکتی تھی، بارش ہو رہی تھی، اسے جگّے کی یاد آگئی۔ ملہی کو رہا کیا جا چکا ہے، ہو سکتا ہے جگا بھی گھر لوٹ آیا ہو۔ وہ جانتی تھی کہ نہیں آیا ہوگا لیکن اس کے من نے اُسے کچھ نہ کچھ کرنے پر اُکسایا۔

نوراں برستے مینہ میں باہر نکل گئی۔ اس نے گلیوں میں کئی لوگوں کو اِدھر اُدھر آتے جاتے دیکھا۔ جنھوں نے بوریوں کی بنی برساتیاں سر پر اوڑھ رکھی تھیں۔ سارے گاؤں میں لوگوں کے بولنے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ کئی گھروں سے دیوں کی مدھم لویں پھوٹ رہی تھیں۔ کئی لوگ سامان باندھ رہے تھے اور کئی بندھوانے میں مدد دے رہے تھے اور کئی لوگ اپنے اپنے دوستوں سے بات چیت کر رہے تھے۔ عورتیں زمین پر بیٹھی ایک دوسرے کے گلے لگ کر رو رہی تھیں۔ کچھ اس طرح جیسے گھر میں موت ہو گئی ہو۔

نوراں نے جگّے کے گھر کا دروازہ ہلایا۔ دروازے کی اندرونی زنجیر بجی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ پھر نیم تیرگی میں اس نے دیکھا کہ کھٹکا باہر سے چڑھا ہوا تھا۔ وہ کھول کر اندر جا گھسی۔ جگّے کی ماں گھر میں نہیں تھی، شاید جانے والوں سے ملاقات کے لیے نکلی تھی۔ کہیں دیا بھی روشن نہیں تھا۔ نوراں چارپائی پر بیٹھ گئی۔ وہ صرف جگّے کی ماں سے ہی ملاقات کی خواہش مند نہیں تھی بلکہ پھر اپنے گھر بھی نہیں جانا چاہتی تھی۔ اس نے سوچا کوئی معجزہ رونما ہو سکتا ہے۔

شاید جگا ہی کہیں سے آ جائے۔ وہ آس لگا کر بیٹھ گئی۔ وہ ملیجی مدھم بادلوں کو ایک دوسرے کا تعاقب کرتے دیکھتی رہی۔ بارش کبھی تیز ہو جاتی اور کبھی ہلکی اور پھر کیچڑ بھری گلی میں اسے کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ دروازے پر آ کر یہ چاپ بند ہو گئی کسی عمر رسیدہ آواز نے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔ "کون ہے؟"

نوراں گھبرا گئی

"کون ہے اندر" آواز تیز ہو گئی، "بولتے کیوں نہیں۔"

نوراں کھڑی ہو گئی اور بڑبڑاہٹ میں بولی "بے بے"۔

دروازہ بند کر کے بڑھیا بڑی عجلت میں اندر چلی آئی۔

"جگا! بچے! تم ہو؟ تمھیں چھوڑ دیا انھوں نے؟" بڑھیا نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

"نہیں! بے بے، میں ہوں ـــــ نوراں، چاچا امام بخش کی بیٹی، لڑکی نے سہم کر کہا۔

" نورو" تم یہاں کیا کرنے آئی ہو اس وقت" بڑھیا تندی سے بولی۔

"جگا آ گیا، بے بے؟" اس نے حوصلہ مجتمع کر کے پوچھ ہی لیا۔

"تم نے کیا لینا ہے جگے سے؟" بڑھیا بولی "تم نے تو اسے جیل بھجوا دیا ہے تم نے اسے بدمعاش بنا دیا ہے۔ کیا تمھارے باپ کو یہ معلوم نہیں کہ تم کس طرح آدھی رات کے وقت دوسروں کے گھروں میں جا گھستی ہو؟"

نوراں رونے لگی "ہم کل چلے جائیں گے بے بے"۔

لیکن نوراں کے آنسو اس چٹان سی بڑھیا کو موم نہ کر سکے۔

"جاؤ جس کنوئیں میں گرنا ہے گرو، ہمارا تمھارا کیا ناطہ، تم نے ہمارے گھر کو ہی تاک لیا ہے؟"

"لیکن میں جا نہیں سکتی۔ جگے نے میرے ساتھ نکاح پڑھوانے کا وعدہ کیا تھا مجھ سے؟"

"نکل میرے گھر سے کتیا نہ ہو کہیں کی، تم مسلمان جولاہے کی بیٹی سکھ جاٹ سے بیاہ کرو گی۔ نکل جاؤ ورنہ میں تمھارے باپ کو جا کر اطلاع دوں گی۔ جا پاکستان کو، میرے بیٹے کا دامن چھوڑ۔"

"اچھا بے بے، میں چلی جاؤں گی، غصہ نہ کر ـــــ جب جگا آئے تو کہہ دینا کہ نورو ست سری اکال کہنے آئی تھی" نوراں نے بڑھیا کے پاؤں پر گر کر کہا۔

"بے بے، میں جا رہی ہوں، پھر کبھی نہیں آؤں گی، مجھے اس وقت نہ جھڑکنا۔ اب میں جا رہی ہوں۔"

بڑھیا اسی طرح اکڑ کر کھڑی رہی مگر اس کے دل میں پہلے جیسی سختی نہ رہی تھی "میں کہہ دوں گی بجگے سے" اس نے لاپرواہی سے کہا۔

نوراں نے رونا بند کر دیا۔ وہ گہری گہری سسکیاں بھرنے لگی۔ وہ ابھی تک بجگے کی ماں کے پاؤں پر گری ہوئی تھی "بے بے" اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

"اور کیا کہنا ہے تم نے" بڑھیا نے اس کی منت و زاری کو بھانپتے ہوئے کہا۔

"بے بے۔"

"بے بے بے بے کہو کیا کہتی ہو؟ بولتی کیوں نہیں؟" بجگے کی ماں نے نوراں کو اپنے سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"بے بے! میری کوکھ میں بجگے کا خون ہے" نوراں نے گلے میں پھنسا آنسو کا گولا نگلتے ہوئے کہا۔ "اور اگر میں پاکستان چلی گئی تو وہ اسے ختم کر دیں گے۔ یہ سکھ کا خون ہے" نوراں نے ایک بار پھر بڑھیا کے پاؤں پکڑ لیے۔

اس بار بجگے کی ماں کا دل بھر آیا "کتنی دیر کا ہے، یہ؟"

"مجھے تو ابھی پتہ چلا ہے، دوسرا مہینہ ہے۔"

بجگے کی ماں نے نوراں کو پکڑ کر بٹھا لیا اور دونوں چارپائی پر ایک دوسرے سے جڑ گئیں۔ نوراں نے سسکنا بند کر دیا۔ "میں تجھے یہاں نہیں رکھ سکتی" بجگے کی ماں نے کہا۔ "پہلے ہی پولیس ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ جب یہ معاملہ طے ہو جائے گا تو بجگا تمھیں آکر لے جائے گا جہاں کہیں بھی تم ہو گی۔ تمھارے چاچا کو علم ہے؟"

"نہیں، اگر اسے پتہ چل گیا تو وہ میری شادی کہیں اور کر دے گا یا مجھے مار ڈالے گا۔" وہ پھر رونے لگی۔

"اچھا اب یونہی نہ روئے جا" بڑھیا نے ذرا سختی سے کہا۔ "اس وقت کیوں نہ سوچا، جب سوچنے کا وقت تھا؟ میں نے تجھے بتا دیا ہے جگا رہا ہوتے ہی تجھے لے آئے گا۔"

"بے بے اسے زیادہ دیر نہ کرنے دینا" نوراں نے سسکی ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"وہ اپنے آپ ہی دوڑا آئے گا۔ اگر تمھارے ساتھ شادی نہ کرے گا تو پھر خرچ کر کے کہاں سے لے آئے گا وہ؟ فکر نہ کر۔"

ایک مبہم سی امید نے نوراں کے وجود کو بھر دیا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اسی گھر کا ایک فرد تھی اور وہ گھر اسی کا ہے۔ جس چارپائی پر بیٹھی تھی جو بھینس اس کے سامنے بندھی تھی، جہاں اس کے پاس کھڑی تھی، سب اسی کی تھیں جلد پہنچے نہ پہنچے وہ اکیلی ہی دوڑ کر اس گھر میں آجائے گی۔ وہ انھیں بتا دے گی کہ اس نے شادی کر لی ہے لیکن پھر وہ اپنے باپ کی بابت سوچ کر اداس ہو گئی۔ اس کے چاند، خواب، بادلوں کی اوٹ میں چھپ گئے۔ وہ باپ کو اطلاع دیے بغیر ہی بھاگ آئے گی۔ اس نے سوچا اور بادل چھٹ گئے۔

"بے بے، اگر ہو سکا تو میں صبح کو پھر آؤں گی ست سری اکال کہنے۔ اب میں جاتی ہوں، چل کے سامان باندھتی ہوں" اور پھر نوراں نے زور سے بڑھیا کو گلے لگا لیا اور ایک بار ست سری کال کہہ کر چلی گئی بگے کی ماں کتنی ہی دیر اپنی چارپائی پر بیٹھی اندھیرے میں گھورتی رہی۔

منو ماجرا میں بہت سے لوگوں نے وہ رات جاگ کر کاٹی۔ وہ گھروں میں ایک دوسرے سے ملاقاتیں کرتے، باتیں کرتے، روتے، پیار و محبت کی قسمیں کھاتے اور ایک دوسرے کو دلاسے دیتے پھرتے رہے۔

امام بخش بھی سارے مسلمان گھروں میں خبر دے کر نوراں کے آنے سے پہلے ہی گھر آگیا تھا۔ گھر کا سامان یونہی پڑا تھا۔ وہ اتنا اداس تھا کہ اپنی بیٹی سے غصے کا اظہار بھی نہ کر سکا۔ جدائی کا خوف بچوں، بوڑھوں سبھی کو رلا رہا تھا۔ نوراں اپنی سہیلیوں سے ملنے گئی ہوگی۔ اس نے گوشوں میں سے بوریاں، کنستر اور ٹرنک تلاش کرنے شروع کر دیے۔ اسی وقت نوراں بھی آگئی۔

"مل آئی ہو اپنی ساری سہیلیوں سے؟ آؤ سونے سے پہلے پہلے سامان سنبھال لیں" امام بخش نے کہا۔

"تم سو جاؤ، میں خود ہی چیزیں باندھتی ہوں، یہ تو کوئی بڑا کام نہیں، یوں بھی تم تھکے ہوئے ہوگے" نوراں نے جواب دیا۔

"ہاں، میں تھوڑا سا تھکا ہوا ہوں" امام بخش نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ابھی تم کپڑا لتا سنبھال لو، کھانے کے برتن پھر باندھ لیں گے صبح کے وقت ساتھ لے جانے کے لیے کھانا تیار کر کے امام بخش چارپائی پر ٹانگیں پھیلا کر سو گیا۔

نوراں کے پاس بھی زیادہ کام نہیں تھا۔ اس نے اپنے اور اپنے چاچا کے استعمال کے کپڑے اس

ٹرنک میں ڈال لیے جو اس کے ہوش سنبھالنے سے پہلے خرید کر رکھا گیا تھا۔ اس نے اگلے دن کے لیے دو روٹیاں پکانے کے لیے چولہے میں آگ روشن کرلی۔ نصف گھنٹے میں اس نے روٹیاں پکا کر برتن مانجھ لیے اور پھر بوری میں بھر دیے۔ بچا کھچا آٹا اور نمک سگرٹوں کے ڈبوں میں بھر دیا گیا۔ یہ ڈبے اس نے لکڑی کے ڈھکنے والے مٹی کے تیل کے کنستر میں ڈال دیے۔ سب چیزیں سنبھال لی گئی تھیں۔ صرف رضائی کو تکیے کے گرد لپیٹنا باقی تھا۔ تب اس نے سب کچھ چارپائی پر رکھ کر اُس کو بھینس کی پُشت پر لٹکا دیا تھا۔ اپنے ٹوٹے ہوئے آئینے کے ٹکڑے کو تو وہ ہاتھ میں تھام کر بھی لے جا سکتی تھی۔

ساری رات بارش رُک رُک کر برستی رہی۔ صبح ہونے تک پرنالے بہنے لگے تھے۔ رات بھر جاگنے کے بعد گاؤں والے صبح کے وقت بارش اور ہوا کی لوری سے نیند کی آغوش میں دفن ہو گئے۔

نعروں اور پہلے گیئر کی آوازوں کے درمیان کیچڑ بھری لت پت سڑکوں کو چیرتے ٹرکوں کے طوفانِ باد و ہو نے گاؤں والوں کو جگا دیا تھا۔ ٹرک گزارنے کے لیے کشادہ رستے کی تلاش میں ایک فوجی دستے نے منو ماجرا کے اردگرد چکر لگایا۔ سب سے آگے ایک لاؤڈ اسپیکر والی جیپ تھی۔ اس میں دو افسر تھے ایک سکھ (جو لاشوں سے پٹی ہوئی گاڑی کے پیچھے آیا تھا) اور دوسرا مسلمان۔ جیپ کے پیچھے ایک درجن کے قریب ٹرک تھے۔ ایک ٹرک پٹھان سپاہیوں سے بھرا ہوا تھا اور دوسرا سکھ سپاہیوں سے۔ سب سپاہیوں کے پاس اسٹین گنیں تھیں۔

کانوائے گاؤں کے باہر آکر رُک گیا۔ اس سے آگے فقط جیپ ہی گزر سکتی تھی۔ یہ نصف راستہ اور طے کرکے گاؤں کے بہت قریب آگئی اور پیپل کے نیچے بڑے چبوترے کے پاس رُک گئی۔ دو افسر باہر نکلے۔ سکھ افسر نے ایک آدمی کو بھجوا کر نمبردار کو طلب کرلیا۔ مسلمان افسر کے ساتھ پٹھان سپاہی تھے۔ اُن کو اُس نے مسلمانوں کو نکال لانے کا حکم دیا۔ وہ ہر گھر کے دروازے کی زنجیر کھٹکھٹاتے اور آواز دیتے "پاکستان جانے والے سب مسلمان آجائیں، جلدی جلدی سب مسلمان ــــ پاکستان جانے کے لیے آجاؤ۔"

آہستہ آہستہ سبھی مسلمان گھروں سے باہر نکلنے شروع ہو گئے۔ انھوں نے اپنے مویشیوں اور بیل گاڑیوں پر چارپائیاں، بستر، ٹین کے ٹرنک، مٹی کے تیل کے کنستر اور مٹی کے گھڑے تک رکھے ہوئے تھے۔ منو ماجرا کے سب سکھ انھیں الوداع کہنے کے لیے آگئے۔

دونوں افسر اور نمبردار سب سے آخر میں باہر نکلے، جیپ ان کے پیچھے پیچھے تھی۔ وہ بہت زور زور سے اشارے کرکے باتیں کر رہے تھے۔ مسلمان افسر نمبردار کو سمجھا رہا تھا کہ ہمارے پاس یہ سارا سامان لے جانے کا کوئی بندوبست نہیں، یہ گاڑیاں، بستر اور برتن یاس نہیں جا سکتے، ہم ان مہاجرین کو براہ راست پاکستان نہیں لے جا رہے ہیں۔ ہم انھیں چندر نگر کے ریفیوجی کیمپ میں چھوڑ دیں گے جہاں سے انھیں گاڑی میں سوار کرا کے لاہور لے جایا جائے گا۔ یہ صرف اپنے کپڑے، بستر، نقدی اور گہنے ہی لے جا سکتے ہیں ان سے کہہ دو کہ وہ ساری چیزیں یہیں چھوڑ جائیں اور آپ لوگ ان کی حفاظت کرتے رہیں۔"

نمبردار کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو صرف چندر نگر کے ریفیوجی کیمپ تک ہی لے جایا جا رہا ہے، لیکن ان کے پاکستان لے جانے جانے کی بات سن کر وہ حیران رہ گیا۔ "نہیں صاحب! ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔" وہ بولا، "ایک دو دن کی بات ہوتی تو ہم ان کے سامان کی حفاظت کر سکتے تھے اور اگر آپ انھیں پاکستان لے جا رہے ہیں تو شاید واپسی میں کئی مہینے ہی لگ جائیں۔ جاندار چیز ہے، یہ تو دلوں میں میل بھرتی ہے۔ نہیں ہم ان کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ ہم تو صرف ان کے گھروں کی ہی حفاظت کر سکتے ہیں۔"

مسلمان افسر نے نمبردار کا نقطۂ نظر جان کر انھیں خود ہی مخاطب کرنا درست جانا۔ اس نے سب کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی مجبوری بیان کی اور آس دلائی کہ وہ موٹا موٹا سامان بھر کر لے جا سکتے ہیں۔

مسلمان اپنی گاڑیاں اور چارپائیاں چھوڑ کر ٹرکوں میں سوار ہونے لگے لیکن نمبردار اور بھائی ست سنگھ اب بھی مسلمانوں کے مال و اسباب کو ہاتھ لگانے سے گریز کر رہے تھے۔

"کیوں سردار صاحب؟" ست سنگھ نے سکھ افسر کو مخاطب کرکے کہا: "دوسرے کے مال و اسباب کو ہاتھ لگانا پاپ نہیں ــــ اس سے بہت سے غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں؟"

سکھ افسر غصے میں بڑبڑا رہا تھا کہ پیچھے سے ملکھی کی آواز آئی۔

"سردار صاحب! اس گاؤں کے لوگ اپنی فیاضی کے لیے بہت شہرت رکھتے ہیں!"

"یہ تو اپنے آپ کو نہیں سنبھال سکتے، کسی کی چیزیں کیا سنبھالیں گے۔ آپ فکر نہ کریں، ہم سنبھالیں گے مسلمانوں کا مال و اسباب" اس نے اپنے ٹولے کے آدمیوں اور ان نئے تے شہزار تھیلا

کی طرف اشارہ کیا جنھیں وہ ابھی ابھی ساتھ لے کر آیا تھا: "ہم سب کچھ سنبھال لیں گے آپ ایک یا دو سپاہی چھوڑ جائیں ہمارے پاس، جو ان میں سے کسی کو یہ سامان نہ چھونے دیں۔"

یہ کسی طویل بات چیت یا نبٹنے نمٹانے کا وقت نہیں تھا، کسی کو الوداعی کلمات کہنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ ٹرکوں کے انجن اسٹارٹ کر دیے گئے۔ پٹھان سپاہیوں نے مسلمانوں کو اکٹھا کیا اور انھیں ایک دو منٹ کے لیے ان کے سامان کے پاس لے گئے اور پھر ٹرکوں میں بٹھانا شروع کر دیا۔ بارش، کیچڑ اور سپاہیوں کے دباؤ کی بنا پر کوئی ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہ سکا۔ وہ ٹرک میں سے ہی اونچی آواز میں سلام و پیام دینے لگے۔ مسلمان افسر نے گاؤں کے چاروں طرف نظر گھمائی اور پھر سکھ افسر کو خدا حافظ کہنے کے لیے آیا۔ دونوں نے ایک مشینی انداز میں ہاتھ ملائے۔ کسی مسکراہٹ یا خوش اخلاقی کے بغیر جیپ ٹرکوں کی قطار کے جلو میں پہنچ گئی۔ لاؤڈ اسپیکروں میں سے ایک بار پھر آواز آئی کہ وہ جانے کے لیے تیار ہیں اور پھر مسلمان افسر نے نعرہ لگایا "پاکستان" اور اس کے سپاہیوں نے یک آواز جواب دیا "زندہ باد"۔ یہ کارواں کیچڑ میں چھپ چھپ کرتا چندر نگر کو روانہ ہو گیا۔ جب تک وہ آنکھوں سے اوجھل نہ ہو گئے سکھ انھیں وہیں کھڑے دیکھتے رہے اور پھر انھوں نے اپنی آنکھوں کے آنسو پونچھ کر بھاری دلوں سے گاؤں کی جانب رُخ پھیر لیا۔

ایک شام گاؤں کے سارے سکھ اور محنت کش "رہوراس" کے وقت گوردوارے میں اکٹھے ہونے کے لیے گئے۔ یوں جیسا کبھی یا گورو جنم دن کے سوا کبھی کوئی "رہوراس" کے لیے گوردوارہ نہیں جاتا تھا عام طور پر عمر رسیدہ مرد اور عورتیں ہی یہاں آیا کرتے تھے۔ باقی اپنے بچوں کے نام رکھوانے، انھیں امرت نوش کروانے یا شادی و مرگ یا جنم کی رسوم کی ادائیگی کے وقت ہی گوردوارے میں آتے تھے لیکن لالہ رام لال کے قتل کے بعد گوردوارے میں حاضری بڑھنے لگی تھی۔ مسلمانوں کے جانے کے بعد تو رونق اور بھی بڑھ گئی تھی۔ لوگوں کو ان کے خالی، اندھیرے اور چوپٹ کھلے دروازوں والے گھروں سے خوف آتا تھا۔ مسلمانوں کے گھروں کے قریب سے لوگ تیزی سے گزر جاتے اور ان پر نگاہ ڈالنے سے گریز کرتے۔ مسلمانوں کے جانے کے بعد ہونے والی بارشوں نے کمزور چھتوں اور دیواروں والے مکان بھی ڈھا دیے تھے اور دریا میں اتنی طغیانی آئی کہ ایک چھوٹا سا سمندر سا نظر آنے لگا اور پھر اس سمندر میں انھوں نے کئی

مویشی اور انسان بستے ہوئے دیکھے تھے۔ گوردوارہ ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں سبھی لوگ بلا خوف و خطر مل بیٹھتے تھے۔ مرد باہم مشورہ کرنے کے بہانے آجاتے تھے۔ عورتیں ان کے ساتھ چل پڑتی تھیں اور بچے کسی پر بھروسہ نہیں کرتے تھے۔ گوردوارے کی بڑی ڈیوڑھی جہاں گرنتھ صاحب کی زیارت ہوتی تھی۔ اور دو ملحقہ کمرے سب کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ یہاں بیٹھنے والوں کے جوتے قطار در قطار دہلیز کے باہر رکھے تھے۔

ست سنگھ لال ٹین کی روشنی میں "رہوراس" پڑھ رہا تھا اور اس کے پیچھے کھڑا ایک آدمی مور چھل ہلا رہا تھا۔ جب رہوراس ختم ہوئی تو بھائی ست سنگھ گرنتھ صاحب کو ریشمی رومال میں لپیٹنے لگا۔ جب اس نے گرنتھ صاحب کو اپنی عقیدت پیش کی تو سب دعا کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے ہاتھ جوڑ لیے۔ ست سنگھ ان کے جلو میں کھڑا ہوگیا۔ اس نے دس گروؤں، پانچ پیاروں، چالیس مکتیوں اور مشہور گوردواروں کے نام لیے اور صالحین و حاضرین واہی گورو واہی گرو پکارتے چلے گئے اور پھر سب نے بہ عالم سجود زمین پر اپنی پیشانیاں رگڑیں اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔ رسم ختم ہوگئی تو بھائی ست سنگھ حاضرین میں آشامل ہوا۔

یہ بہت سنجیدہ اجتماع تھا۔ صرف بچے ہی کھیل میں محو تھے۔ وہ کمروں کے آس پاس ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے اور شور مچاتے ہنس رہے تھے۔ بزرگوں نے بچوں کو گھور کر دیکھا تو بچے ایک ایک کرکے اپنی ماؤں کی اوڑھنیوں میں چھپ کر خاموش ہوگئے۔ عورتیں اور مرد بھی جہاں جگہ ملی جسم پھیلا کر پڑ گئے۔

لیکن دن کے مناظر انھیں نیند میں بھی نہ بھول سکے۔ کتنے لوگوں کی تو بالکل آنکھ ہی نہ لگی۔ اور جو سوئے بھی، وہ ساتھ والے آدمی کی ٹانگ یا بانہہ چھو جانے سے ہڑبڑا کر اٹھ جاتے۔ جو خراٹے لیتے ہوئے بے فکر نظر آتے تھے، وہ خوابوں میں دن کے سانحوں کی تصویریں دیکھ رہے تھے۔ انھیں موٹروں کے انجنوں کی گڑگڑ اور مویشیوں کی بے چین آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ سوتے میں سسکیاں بھر رہے تھے اور ان کے چہرے اور داڑھیاں آنسوؤں سے نم ہوگئے تھے۔

اور جب صبح سویرے ہی موٹر کے ہارن کی آواز سنائی دی تو جاگ کر اونگھ رہے تھے انھیں لگا جیسے وہ خواب دیکھ رہے ہوں۔ پھر جب کسی کی دوسرے "کیا تم سب مر گئے" کی آواز آئی تو وہ نیند اور اونگھ

کے بیچ "ہاں" کہتے چلے گئے۔

پو پھٹے آنے والی جیپ بھی اسی جیسی تھی جس میں گزشتہ صبح کو فوج کے افسر آئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے گاؤں کا راستہ تلاش کرتی ہوئی آئی ہو یہ ہر گھر میں آواز دیتی ہوئی آئی تھی کوئی گھر میں ہے یا نہیں" جواب میں صرف بھونکتے ہوئے کتے ہی ملے تھے اور پھر یہ گوردوارے کے پاس آکر رک گئی اس میں سے نکل کر آنے والے دو آدمی گوردوارے کے پہلو میں آکھڑے ہوئے اور بولے" کوئی ہے یہاں' یا تم سبھی مرگئے ہو؟"

سبھی جاگ گئے۔ کئی بچے رونے لگے۔ ست سنگھ نے آکر لال ٹین کی لو بڑھائی اور نمبردار کو لے کر باہر نکلا۔

آنے والوں کو اپنی آمد سے پیدا شدہ شوروغل کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ بھائی ست سنگھ اور نمبردار کو نظر انداز کر کے آگے بڑھا چوکھٹ پر چلے آئے۔ ایک نے گھبرائے ہوئے لہجے میں اندر جھانک کر لوگوں سے کہا۔

"کیا تم سب مرگئے ہو؟"

"یہاں کوئی زندہ بچا ہے یا نہیں" دوسرا بھی بول پڑا۔

اور پھر نئے آنے والوں نے اپنے جوتے اتارے اور گوردوارے کی ڈیوڑھی میں چلے گئے۔ نمبردار اور بھائی ان کے پیچھے پیچھے ہو گئے مردوں نے بیٹھ کر پگڑیاں کسنی شروع کر دیں۔ عورتوں نے اپنے بچے گود میں ڈال کر سلانے شروع کر دیے۔

جو بھی اس ٹولے کا لیڈر لگتا تھا اس نے دوسروں کو ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔ سبھی بیٹھ گئے۔ لیڈر کا انداز جوشیلا اور تحکم آمیز تھا وہ بمشکل اٹھارہ انیس برس کا نوجوان تھا جس کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ وہ بڑا ہلکا پھلکا اور تیز طرار سا جوان تھا۔ دیکھنے میں وہ لڑکیوں جیسا لگتا تھا۔ اس کی گہری نیلی پگڑی کے نیچے سے لال عنابی رنگ کی پٹی دکھائی دے رہی تھی۔ خاکی رنگ کی فوجی قمیض اس کے ڈھلوان کندھوں سے نیچے لٹک رہی تھی۔ اس کی سوکھی ہوئی چھاتی پر کارتوسوں کی پیٹی لٹک رہی تھی اور مختصر سی کمر میں ایک دوسری ڈھالی پیٹی تھی۔ کارتوسوں والی پیٹی کے بائیں جانب پستول لٹک رہی تھی اور دائیں طرف کٹار تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ماں

نے اسے گھر سے امریکی کاؤ بوائے بنا کر رخصت کیا ہو۔

اس لڑکے نے اپنی پستول کو ہاتھ سے دبایا اور اپنی انگلیاں پیٹی میں لگے کارتوسوں کے ننگے سروں پر پھیرنی شروع کر دیں۔ بڑے ایقان کے ساتھ اس نے اپنے ارد گرد دیکھا "یہ سکھوں کا گاؤں ہے؟" اس نے دانستہ گستاخی سے کہا۔

گاؤں والوں کو وہ شہر کا طالب علم لگا۔ جاہلوں سے بات کرتے وقت اس طرح کے لڑکے ہمیشہ ایک احساس برتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ کسی کی عمر یا منصب کا احترام نہیں کرتے۔ "ہاں جی، یہ سکھوں کا گاؤں ہے اور ہمیشہ سکھوں کا ہی رہا ہے" نمبردار نے جواب دیا۔ "یہاں مسلمان مزارعین تھے جو چلے گئے ہیں۔"

"کس قسم کے سکھ ہو تم لوگ" لڑکے نے آنکھیں نکال کر دھمکی دیتے ہوئے کہا "مرد کیا زنخے؟"

کوئی نہ جان سکا کہ کیا جواب دیا جائے۔ لیکن کسی نے بھی اس بات پر اعتراض نہ کیا کہ گوردوارے میں بیٹیوں، بہنوں کے سامنے یہ کس قسم کے الفاظ استعمال کر رہے تھے۔

"تمھیں علم ہے کہ کتنی ہی گاڑیاں ہندوؤں اور سکھوں کی لاشوں سے پٹی ہوئی آئی ہیں ادھر۔ کیا تمھیں راولپنڈی، ملتان، گوجرانوالہ اور شیخوپورہ کے خون خرابے کی کوئی اطلاع نہیں؟ کیا کر رہے ہو تم اس سلسلے میں؟ کھا کر سو جاتے ہو اور کہتے ہو اپنے آپ کو سکھ، سردار سکھ، دشمیش کے شیر" نوجوان نے اپنے جذبات کو ہاتھوں کے اشاروں سے ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

اس نے آنکھیں پھیلا کر منو ماجرا کے لوگوں کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ آؤ اور میری بات کو غلط ثابت کر کے دکھاؤ ــــ ہے کوئی؟

منو ماجرا کے لوگوں نے شرم کے مارے سر جھکا لیے "ہم کیا کر سکتے ہیں، سردار جی؟" نمبردار نے پوچھا "اگر ہماری حکومت پاکستان سے جنگ کرے تو ہم لڑنے کے لیے تیار ہیں، یہاں بیٹھے ہم کیا کر سکتے ہیں منو ماجرا میں؟"

"سرکار؟" لڑکے نے ناک بھوں چڑھا کر کہا "تم سرکار سے امیدیں باندھے بیٹھے ہو، بزدل بنیوں کی سرکار سے۔ مسلمان اپنی سرکار سے اجازت لے کر ہاتھ اٹھاتے ہیں تمھاری ماں بہنوں پر، ہاں؟ کیا وہ اجازت لے کر قتل کرتے ہیں، بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کا؟ گاڑیاں روک کر؟ ہماری

سرکار سے امید' واہ بھئی واہ' شاباش بہادرو!" اس نے اپنے بائیں پہلو میں لٹکتی پستول کو ایک خاص انداز میں گھماتے ہوئے کہا۔

"لیکن سردار جی" نمبردار نے لرزتے ہونٹوں سے کہا "ہمیں بتاؤ تو سہی کہ ہم کیا کریں؟"

"ہوئی نا پتے کی بات" لڑکا بولا "اب ہو سکتی ہے بات' سنو اور خوب کان کھول کر سنو" اس نے ذرا رُک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر اس نے ایک ایک جملے کے ساتھ دو دو بار اپنی انگلی ہوا میں نچا کر کہنا شروع کیا "اگر وہ ایک ہندو کو ماریں تو تم دو مسلمانوں کو مارو' اگر وہ ایک عورت کی بے حرمتی کریں تو تم دو کی کرو' وہ ایک گھر لوٹیں' تم دو دو لوٹو' ایک گاڑی نعشوں کی آئے تو دو بھجواؤ ہمارے ایک قافلے پر حملہ کریں تو تم دو پر کرو' تب کہیں جا کر یہ خون خرابہ بند ہوگا اس طرف۔ تب انہیں معلوم ہوگا کہ ہم میں بھی دم ہے۔" اس نے بولنا بند کر کے لوگوں پر اپنے تاثر کا جائزہ لیا۔ منو ماجرا کے سبھی باشندے منہ کھولے اسے دیکھ رہے تھے۔ ایک ست سنگھ ہی تھا جس نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور رُک گیا "کیوں بھائی بولتے کیوں نہیں؟" لڑکے نے اسے مدعو کیا۔

"میں کہنا چاہتا تھا" ست سنگھ نے رک رک کر کہنا شروع کیا "میں کہنا چاہتا تھا کہ ہمیں مسلمانوں نے یہاں کیا کہا ہے کہ ہم وہاں کے مسلمانوں کا بدلہ یہاں لیں؟ سزا تو انہیں ملنی چاہیے جو قصور وار ہیں۔"

"اور ہمارے سکھوں یا ہندوؤں نے پاکستان میں کیا کیا تھا کہ انھوں نے انھیں برباد کر دیا ہے۔ کیا وہ بے قصور نہیں تھے؟ عورتوں نے کون سے گناہ کیے تھے کہ ان کی بے حرمتی کی گئی؟ کیا بچوں نے قتل کیے تھے کہ انھیں ان کے ماں باپ کے سامنے نیزوں میں پرو دیا گیا؟"

ست سنگھ ٹھنڈا پڑ گیا اور لڑکے نے اور زور سے کہا۔

"کیوں بھائی؟ اب بولو کیا بولتے ہو؟"

"میں تو بوڑھا بھائی ہوں' میں نے تو کبھی کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا —— لیکن نہتے آدمیوں کو مارنا کون سی بہادری ہے؟ عورتوں کے بارے میں تو خود دشمیش گورو نے کہا ہے کہ عورت سے جنگ نہیں کرنی۔"

"اس جیسی سکھ مت کی تعلیم کسی اور کو دینا" لڑکے نے نفرت سے کہا "تم جیسے لوگوں نے ہی اس دیش کو برباد کیا ہے۔ تمھیں معلوم ہے گورو نے کیا کہا ہے مسلمانوں کے بارے میں؟ سن "ترک میت تب کیجیے جب اور ذات مر جائے"۔

"گوروؤں نے تو مسلمان بھی رکھے ہوئے تھے اپنی فوج میں"۔

"ان میں سے ہی ایک نے خنجر گھونپ دیا تھا سوئے ہوئے گورو جی کو"۔

"ٹھیک ہے ... مسلمان بُرے بھی ہوتے ہیں اور ..."

"بتاؤ اچھے کون سے ہیں؟"

"ست سنگھ کے پاس اب کوئی سوال وجواب باقی نہیں رہا۔ اس نے اپنے پاؤں کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کی خاموشی اُس کی شکست کی گواہی بن گئی۔

"رہنے دو اسے، یہ تو بوڑھا بھائی ہے بے چارا، اسے پاٹھ کرنے دو، قریب کو کئی لوگوں نے مل کر کہا۔

نوجوان خوش ہو گیا۔ اس نے لوگوں کی طرف منہ کر کے اور بھی اونچی آواز میں کہا "یاد رکھو، یہ بات کبھی نہ بھلاؤ کہ مسلمان تلوار کے علاوہ کوئی زبان نہیں سمجھتا"۔

"سچ ہے، سردار صاحب، سچ ہے"۔

"کوئی ہے گورو کا پیارا یہاں؟ جو دھرم کے لیے سر کی بازی لگانے پر تیار ہو؟ کوئی دل گردے والا ماں کا لال؟"

سبھی اہلِ منو اجڑے بے چینی سی محسوس کرنے لگے۔ لڑکے کی تقریر نے سب کو غصہ دلا دیا تھا اور وہ اب اپنی بہادری اور مردانگی کا ثبوت دینا چاہتے تھے۔ یوں بھائی ست سنگھ کے ہوتے ہوئے وہ اس سے بھی بے وفائی نہیں کر سکتے تھے۔ "ہمیں بتاؤ کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" نمبردار نے سوگوار سا ہو کر کہا۔

"میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ہم نے کرنا کیا ہے" لڑکے نے اپنے کولھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "اگر تم میں حوصلہ ہے تو کل ایک مسلمانوں سے بھری ہوئی گاڑی پاکستان جانے کے لیے پل پر سے گزرے گی۔ اگر تم مرد ہو تو اس گاڑی میں بھی اتنی ہی لاشیں پاکستان بھجواؤ، جتنی تم نے اس طرف آتی دیکھی ہیں"۔

منوماجرا پر ایک یخ بستہ خاموشی مسلط ہوگئی۔ سب کے سب لوگ بے چینی سے کھنکھارنے لگے۔

"اس گاڑی میں منوماجرا کے مسلمان بھی ہوں گے؟" ست سنگھ نے بھیڑ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بھائی جی! آپ بہت کچھ جانتے ہیں، ٹھیک ہے ناں؟" نوجوان نے بھڑک کر کہا۔

"تم نے انھیں ٹکٹ دلائے ہیں؟ آپ کا بیٹا گاڑیوں کا بڑا بابو ہے نا؟ میں نہیں جانتا کون سے مسلمان ہوں گے مجھے یہ جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ گاڑی میں مسلمان چلے گئے یہی کافی ہے وہ اس دریا سے جیتے جی نہیں گزر سکتے۔ اگر آپ سننا چاہیں تو میں بات کروں، اگر نہیں تو آپ کہہ دیں کہ ہم چلے جائیں۔ آپ کی ہماری ست سری اکال، ہم کہیں اور تلاش کرتے ہیں اصلی مردجا کر۔"

پھر کچھ دیر کے لیے خاموشی چھاگئی۔ پستول والے لڑکے نے پستول پر انگلیاں چلاتے ہوئے خلا میں گھورنا شروع کر دیا۔

"لیکن پل پر تو فوجی پہرہ لگتا ہے" باہر اندھیرے میں سے کسی کی آواز آئی۔ یہ ملہی تھا۔ وہ گوردوارے میں آوازیں بلند ہوتے سن کر مسلمانوں کی چھوڑی ہوئی املاک کے پاس سے اٹھ کر آگیا تھا۔ اس کے ٹولے کے آدمی اس کے ہمراہ تھے۔

"تم فوج اور پولیس کی فکر نہ کرو، کوئی دخل اندازی نہیں ہوگی ہم دیکھ لیں گے ان کو" نوجوان نے عقب میں دیکھ کر کہا۔ "ہمارا ساتھ ہے کوئی سورما یا نہیں؟"

"میری جان حاضر ہے آپ کے لیے" ملہی نے کہا۔

اصل میں جگے سے مار کھانے کے بعد اس کا دبدبہ ختم ہو گیا تھا۔ یہ بات پورے گاؤں میں پھیل چکی تھی۔ اور اب وہ کوئی بہادری کا کارنامہ کر کے اپنا دبدبہ دوبارہ قائم کرنا چاہتا تھا۔

"شاباش" لڑکے نے بازو پھیلا کر کہا۔ "ایک تو نکلا۔ گروؤں کو سکھ پنتھ کی بنیاد رکھتے وقت پانچ جانوں کی ضرورت پڑی تھی۔ وہ عظیم انسان تھے اور ہمیں آج پنتھ کی حفاظت کے لیے پانچ سے زیادہ چاہییں اور بھی ہے کوئی جان دینے پر تیار؟"

ملہی کے چاروں ساتھی بھی دہلیزیں پھلانگ کر آگئے۔ ان کے پیچھے اور بہت سے لوگ بھی آگئے ___ بیشتر شرنارتھی ہی تھے۔ اہل منوماجرا میں سے بہت سوں کے مسلمانوں کی جدائی میں بہتے آنسو بھی ابھی نہیں سوکھے تھے مگر وہ بھی آگئے۔ کوئی بھی ہاتھ کھڑا کرتا، پستول والا لڑکا "شاباش"

کہہ کر اس کا حوصلہ بڑھاتا اور اسے قبول کر لیتا۔ کوئی پچاس سے زیادہ آدمی تیار ہو گئے سب جانیں قربان کرنے پر تیار "بس بہت ہیں" لڑکے نے ہاتھ کے اشارے سے کہا اگر ضرورت پڑی تو میں پھر لے جاؤں گا۔ آؤ اب ہم دعا کریں"۔

سبھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ عورتیں بھی اپنے بچوں کو چھوڑ کر فرش پر اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ سب نے منجی صاحب کا رخ کر کے ہاتھ جوڑ لیے جہاں گورو گرنتھ صاحب کی زیارت متمکن تھی۔

لڑکے نے پیچھے مڑ کر چڑانے کے انداز میں ست سنگھ سے کہا "آپ کرتے ہیں ارداس بھائی جی"۔

"یہ آپ ہی کا کام ہے سردار صاحب، آپ ہی کیجیے" ست سنگھ نے نرمی سے جواب دیا۔

پستول والے لڑکے نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور آنکھیں بند کر کے دس گوروؤں کے نام لینے شروع کر دیے۔ ان سے "اعضا اور ساتھیوں کے مددگار ہونے" کی التجا کی اور پھر سب نے جھک کر ماتھا ٹیکا۔

نانک نام

چڑھدی کلا

تیرے بھانے سربت دا بھلا

اور سبھی اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے اونچی آواز میں کہنے لگے:

راج کرے گا خالصہ تے آکی رہیے نہ کوئے

خوار ہوئے سبھ ملیں گے بچے شرن جو ہوئے

پھر پستول والے لڑکے نے اونچی آواز میں کہا "جو بولے سو نہال، ست سری اکال" حاضرین نے "جیکارا" گونجا دیا۔ اس کے بعد لیڈر لڑکے کے علاوہ سبھی بیٹھ گئے۔ دعا نے اسے متقی بنا دیا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر حاضرین سے معافی طلب کی "بہنو اور بھائیو! مجھے اس وقت دخل اندازی پر معاف کرنا۔ آپ بھی معاف کرنا بھائی جی اور نمبردار صاحب! کوئی بھول چوک ہو گئی ہو تو معاف کرنا، یہ تو سب گوروؤں کی اطاعت کی بات ہے، جو دوست تیار ہوئے ہیں وہ برابر والے کمرے میں آجائیں اور باقی آرام کریں ست سری اکال"۔

"ست سری اکال" حاضرین میں سے کچھ بڑبڑائے۔

عورتوں اور بچوں کو بغل والے، ایک سمت بنے ہوئے ست سنگھ کے کمرے میں سے اٹھا کر، پستول والے لڑکے نے حاضرین میں سے منتخب شدگان کو ساتھ لے کر اس میں ڈیرا جما لیا۔ گاؤں میں سے دو چار لال ٹینیں منگوا کر پستول والے لڑکے نے ایک چارپائی پر ایک نقشہ بچھا دیا۔ اپنے ہاتھ میں لال ٹین لے کر اس نے نقشے پر روشنی ڈالی اور سبھی لوگ نقشے کو ملاحظہ کرنے کے لیے نزدیک ہو گئے۔

"آپ کو علم ہے کہ آپ کہاں ہیں؟ پل اور دریا کہاں ہیں؟"

"ہاں جی معلوم ہے" سبھی بول پڑے۔

"کسی کے پاس بندوق بھی ہے تم میں سے؟"

سبھی ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے، کسی کے پاس بھی بندوق نہیں تھی۔

"چلو کوئی بات نہیں" لیڈر نے دلاسا دیا" ہمارے پاس چھ سات رائفلیں ہوں گی۔ شاید ایک دو اسٹین گنیں بھی ہوں، تم لوگ اپنی تلواریں، برچھیں اور گنڈاسے لے آؤ، یہ بندوقوں سے زیادہ کارآمد ہیں۔" وہ رک گیا: "اسکیم یہ ہے کہ کل غروب آفتاب کے بعد جب اندھیرا ہو جائے تو ہم پل کی ابتدائی آہنی باڑ کے ساتھ ایک رسی باندھ دیں گے۔ اس کو گاڑی کی چھت سے ایک فٹ اونچا رکھ کر باندھ دیں گے جب گاڑی اس کے نیچے سے گزرے گی تو یہ رسہ چھت پر بیٹھے سبھی مسلمانوں کا صفایا کر دے گا۔ چار پانچ سو تو کھپ جائیں گے۔"

حاضرین کی آنکھیں یہ اسکیم سن کر کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ انھوں نے مرعوب ہو کر سر ہلائے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ نمبردار اور ست سنگھ بھی دروازے میں کھڑے سنتے رہے۔ لڑکے نے انھیں دیکھ کر غصے میں کہا "بھائی جی، آپ نے کیا لینا ہے اس سے؟ تھانے جا کر رپورٹ تو نہیں کرنی آپ نے؟"

سبھی کھلکھلا کر ہنس پڑے، کیوں کہ تھانے میں ان دنوں کسی کی شنوائی نہیں ہو رہی تھی۔

لڑکے نے ہاتھ بلند کر کے اپنے جوانوں کو خاموش کروا دیا، "گاڑی نے نصف

شب کو چندر نگر سے روانہ ہوتا ہے ـــــ اس کی بتیاں گل ہوں گی۔ انجن میں بھی کوئی روشنی نہیں ہوگی۔ پٹری کے ساتھ ساتھ ہر سوگز کے فاصلے پر اپنے آدمی ٹارچ دے کر کھڑے کر دیں گے۔ گاڑی کے روانہ ہوتے ہی وہ ٹارچ کی روشنی سے ایک دوسرے کو اشارہ کریں گے۔ تم سب کو اطلاع مل جائے گی اور برچھے اور تلواروں والے آدمی اسی وقت چھت سے گرے لوگوں کو سنبھالنے کے لیے پُل پر پہنچ جائیں گے۔ گرے ہوئے آدمیوں کو مار کر دریا میں بہا دو۔ بندوقوں والے ذرا آگے ہو کر ڈبوں میں گولیوں کی بوچھاڑیں کر دیں۔ واپسی گولی کا کوئی خطرہ نہیں۔ گاڑی میں صرف درجن بھر پاکستانی سپاہی ہوں گے۔ اندھیرے میں انھیں پتہ ہی نہیں چلے گا کہ نشانہ کہاں کا لیں، انھیں گولیاں بھرنے کا موقع تک نہیں ملے گا۔ اگر گاڑی روک بھی لی تو ہم دیکھ لیں گے، تب ہم باقیماندہ کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔"

یہ اسکیم بہت زبردست تھی۔ کسی قسم کا نقص نہیں تھا اور کسی قسم کا اندیشہ بھی نہیں تھا۔ سبھی خوش ہو گئے۔

"اب آدھی رات بیت چکی ہے" لڑکے نے نقشے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

"تم سبھی تھوڑی دیر کے لیے آرام کرو" کل صبح ہم پل پر جا کر فیصلہ کریں گے کہ کہاں کہاں، اکیلا اکیلا آدمی کھڑا کیا جائے گا ـــــ شری واہی گورو جی کا خالصہ، شری واہی گورو جی کی فتح"

"شری واہی گورو جی کی فتح" سب نے بیک آواز کہا۔

سبھی حاضرین بکھر گئے۔ باہر سے آئے ہوئے یہ اجنبی گوردوارے ہی میں سو گئے۔ ملی اور اس کے گروہ کے لوگ بھی وہیں سو گئے۔ کئی گاؤں والے پہلے ہی اپنے گھروں کو جا چکے تھے، وہ ڈرتے تھے کہ اس سازش میں شریک ہونے کے باعث گناہ ان کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ نمبردار اسی وقت دو آدمی ساتھ لے کر تھانہ چندر نگر کو روانہ ہو گیا۔

• آپ لوگ دیکھیں گے کہ منو ماجرا اب وہ نہیں رہا" تھانیدار نے سامنے

دھری میز کی طرف منہ کر کے کہا۔ میز کی دوسری جانب اقبال اور جگا کھڑے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"آپ تشریف کیوں نہیں رکھتے بابو جی" تھانیدار نے اقبال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "اوئے کیا نام ہے تیرا؟ تم کرسی کیوں لا کر نہیں دیتے۔ بابو صاحب کو؟" اس نے سپاہی کو لتاڑا اور پھر اقبال کو مخاطب کر کے بولا "میں جانتا ہوں آپ مجھ سے ناراض ہیں لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں تو اپنا فرض ادا کرتا ہوں بابو جی، آپ تو پڑھے لکھے ہیں اور جانتے ہیں کہ اگر میں اپنا سلوک بدل دوں تو اس سے کیا نتیجہ برآمد ہوگا۔"

سپاہی اقبال کے لیے کرسی لے آیا۔

"تشریف رکھو ـــــ آپ کے لیے اب چائے کا گلاس منگا دو" تھانیدار نے قدرے مسکرا کر کہا۔

"آپ کی بڑی مہربانی، انسپکٹر صاحب، میں کھڑا ہوا اچھا لگتا ہوں، میں بہت بیٹھا ہوں اس کوٹھری میں، گستاخی معاف، میں آپ کی کارروائی کے ختم ہوتے ہی چلا جانا چاہتا ہوں" اقبال نے تھانیدار کی مسکراہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کا جب جی چاہے، جہاں جی چاہے جائیے۔ میں نے آپ کے لیے تانگہ منگوانے کے لیے سپاہی بھجوایا ہوا ہے۔ آپ کے ہمراہ ایک مسلح سپاہی جائے گا اور آپ کو پہنچا آئے گا۔ یہ دن بہت خراب ہیں۔"

اس وقت تھانیدار نے ایک زرد کاغذ ہاتھ میں لے کر اونچی آواز میں پڑھا "جگت سنگھ ولد عالم سنگھ، عمر چوبیس سال، ذات سکھ جاٹ، ساکن منو ماجرا، بدمعاش نمبر دس۔"

"حاضر ہوں جناب" جگے نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پولیس کی مار پیٹ نے اس کے رویے میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی تھی، وہ کون سے جگے کی نسبت بہتر لوگ تھے، وہ اسے گرفتار کر کے، گالیاں دے کر، مار پیٹ کر سدھارنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا کوئی بھی عمل انسانیت پر مبنی نہیں تھا۔ جگا ان کے پاس آ پھنستا تھا ـــــ جگے کی تقدیر۔

"تمھیں بری کیا جاتا ہے لیکن تمھیں دسویں مہینے کی پہلی تاریخ کو علی الصبح پیش ہونا

ہے، حکم چند ڈپٹی کمشنر کی عدالت میں، اسی سال ۱۹۴۷ء میں، یاد رکھنا ــــــ لگا دو اپنا انگوٹھا یہاں۔"

تھانیدار نے جگے کا انگوٹھا پکڑ کر اسٹمپ پیڈ پر گھسا اور جب اس سے بھی سیاہی نہ لگی تو اپنے قلم سے اس پر سیاہی لگا کر اسے پکڑے پکڑے زرد کاغذ پر ثبت کر دیا۔

"مجھے اجازت ہے جناب" جگے نے پوچھا۔

"تم بابو صاحب کے ساتھ چلے جاؤ تانگے میں بیٹھ کر، ورنہ اندھیرا ہوئے پہنچو گے اپنے گھر" اور پھر تھانیدار نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "گاؤں تمھارا پہلے جیسا نہیں رہا اب۔ منو ماجرا سے سبھی مسلمان چلے گئے ہیں۔" تھانیدار نے اداکاروں کے سے انداز میں کہا:

"کل رات انھیں کیمپ لے جایا گیا تھا اور آج رات گاڑی میں پاکستان لے جایا جائے گا۔"

"کیا ہو گیا تھا گاؤں میں، انسپکٹر صاحب کہ انھیں گاؤں چھوڑنا پڑا۔"

"ہوا تو کچھ نہیں تھا۔ اگر وہ گاؤں سے نہ جاتے تو ضرور کچھ ہو جاتا۔ بہت سے اجنبی لوگ بندوقوں سے مسلمانوں کو مار رہے ہیں۔ ملہی اور اس کا ٹولہ بھی ان میں شامل ہو گیا ہے۔ اگر وہ اب تک منو ماجرا نہ چھوڑتے تو ملہی نے ان سب کو اب تک ختم کر دیا ہوتا۔ اس نے ان کی تمام املاک پر قبضہ کر لیا ہے۔ گائیں، بھینسیں، بیل، گھوڑیاں، جوتے، برتن۔"

جگے کو ایک دم غصہ آگیا "وہ سور کا تخم، بہن اپنی کا خصم، ماں کا ملہی، داخل تو وہ ہو منو ماجرا میں، دیکھ لوں گا اُسے۔"

اتنے میں تانگہ آگیا اور وہ دونوں تھانیدار کو ست سری اکال کہہ کر تانگے میں سوار ہو گئے۔

دن ڈھلنے کے ساتھ ہی تانگہ منو ماجرا کے تھانے سے روانہ ہو گیا۔

یہ سفر طویل اور حادثات سے پُر تھا۔ جگا سپاہی کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور عقبی نشست اقبال کے لیے چھوڑ دی گئی۔ کسی کا بھی بات کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

بھولے کو پولیس والے اس وقت باہر لے آئے تھے جس وقت کہ کوئی تانگے والا قدم نکالنے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔ اس نے اس کا غصہ اپنے کاکیائی رنگ کے گھوڑے کو کوڑے مار مار کر پورا کرنا شروع کر دیا۔ باقی سب اپنے اپنے خیالوں میں مگن تھے۔

کھیتوں میں خموشی کا پہرہ تھا، چاروں اور پانی کھڑا نظر آتا تھا، کھیتوں میں کوئی مرد یا عورت دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کوئی مویشی بھی نہیں چر رہا تھا۔ راستے میں وہ جن دو دیہات سے گزرے، وہاں کتوں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ کہیں کہیں کوئی شخص دیوار یا ستون کی اوٹ سے دیکھتا نظر آ جاتا اور اس کے ہاتھ میں بھی چھری یا گنڈاسہ ہوتا۔

جگا نوراں کے بارے میں سوچ رہا تھا، وہ تانگے میں بیٹھے اپنے ہم سفروں یا اطراف کے دیہات کی طرف بالکل نہیں دیکھتا تھا۔ اسے ملیجا بھی فراموش ہو چکا تھا۔ اس کا من یہ بات تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ نوراں منو ماجرا چھوڑ کر چلی گئی ہوگی۔ امام بخش کو کس نے جانے دیا ہوگا۔ اگر وہ چلا بھی گیا ہوگا تو نوراں کہیں نہ کہیں کھیتوں میں، یا اُن کے گھر میں جا چھپی ہوگی اس کی ماں نے اسے گھر سے نہیں نکالا ہوگا اگر نکالا ہوگا تو وہ بھی گھر سے چلا جائے گا اور پھر اپنی ماں کو منہ تک نہ دکھائے گا۔ وہ عمر کے اس آخری حصے میں اپنے کیے پر پچھتائے گی۔

وہ اسی سوچ و بچار میں کھویا ہوا تھا اور کبھی رنجیدہ خاطر ہو جاتا لیکن اچانک اس نے دیکھا کہ تانگہ گاؤں کے گوردوارے والی گلی بھی عبور کر گیا تھا۔ وہ تانگے میں سے چھلانگ مار کر کسی سے بات کیے بغیر اندھیرے میں کھو گیا۔

اقبال نے تانگے سے اتر کر انگڑائی لی اور گوردوارے میں جا داخل ہوا۔ ست سنگھ نے اس سے کھانے کے متعلق پوچھا تو اس نے منع کر دیا اسے پولیس کے تکلیف دہ رویے نے آزردہ کر دیا تھا۔ اسے ہلکا سا بخار آ رہا تھا۔ کچھ یوں جیسے کسی کو بیمار جتانے سے پہلے محسوس ہوا کرتا ہے، اس کے لیے یہ وقت اظہار کا تھا لیکن وہ یہ جان نہ پایا تھا کہ اسے کس طرح اظہار کرنا ہے۔ ست سنگھ سے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کرکے وہ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔

کیا وہ برستی ہوئی گولیوں میں بڑھتا چلا جائے۔ سولائنڈ کے بہادروں کی طرح جو

کیمرے کی طرف دیکھتے ہوئے، بڑے بڑے اور بڑے ہوتے چلے جاتے ہیں اور پھر بڑی شان سے ایک گولی کھا کر ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس کی اس عظیم قربانی کا احساس کون کرے گا۔ اس نے سوچا اور اپنی پتلون کی پچھلی جیب سے ایک وہسکی کی بوتل نکالی اور سلوانڈ کے گلاس کو لبالب بھر کر ایک ہی سانس میں پی گیا۔

جب گولی چل رہی ہو تو سامنے جا کر مرنے کی کیا ضرورت ہے؟ گولی کو بھلے بڑے کی کوئی شناخت نہیں ہوتی۔ اور خدا — نہیں خدا نہیں، خدا کا یہاں کیا کام، اس نے وہسکی کا ایک پیگ اور حلق میں انڈیل لیا۔ اس سے اس کی تخیلاتی قوت تیز ہو رہی تھی۔

اور قربانی؟ کیا ہوتی ہے قربانی، جسے مرنے کے بعد یاد کیا جائے۔ یہ تو اسکول میں کسی دوست کی خاطر مار سہنے کے برابر بھی نہیں۔ آپ اسکول میں دی ہوئی قربانی کو یاد کر کے خوش ہو سکتے ہیں۔ یہاں فقط موت ہے۔ اس نے وہسکی کا ایک اور پیگ چڑھا لیا۔ اس سے اسے اپنے ذہن میں بہت سی باتیں نکھر کر واضح ہوتی دکھائی دیں۔

اگر اصلیت کو دیکھا جائے تو آدمی یا خدا دونوں میں سے کسی کا کوئی اصول نظر نہیں آتا، جس کے مطابق زندگی کو ڈھالا جائے۔ جس طرح گناہوں پر نیکیاں فتح پا سکتی ہیں، اسی طرح گناہ بھی نیکیوں پر فتح پا لیتے ہیں۔ کئی بار گناہوں کی فتح عظیم ہوتی ہے۔ نتیجے میں کس کو کامرانی میسر آتی ہے، کوئی نہیں جانتا۔ ان حالات میں سب اقدار سے بے نیاز ہو جانے سے بڑی کوئی بات نہیں، فرق ہی کیا پڑتا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔

اس نے وہسکی کی بوتل ہی منہ سے لگا لی۔ بالکل پانی تھا۔ اس میں ذائقہ نام کی کوئی شے نہ تھی۔ اس نے بوتل کو ہلا کر دیکھا۔ اندر سے کسی چیز کے چھلکنے کی آواز آئی۔ یہ خالی نہیں تھی۔ خدا کا شکر ہے یہ خالی نہیں تھی۔

اور پھر اقبال سلوانڈ کا گلاس اپنے ہاتھ میں اور وہسکی کی بوتل بغل میں لے کر سو گیا۔

گوردوارے کی بغل میں جلتے چولہوں کی آگ بجھ چکی تھی۔ کبھی کبھی ہوا کا جھونکا کسی سلگتے ہوئے کوئلے کو جگمگا دیتا۔ لال ٹینوں کی لوئیں نیچی کر دی گئی تھیں۔ مرد، عورتیں

او بچے ڈیوڑھی میں لمبی تان کر سوئے ہوئے تھے۔ صرف ست سنگھ ہی جاگ رہا تھا۔
وہ فرش پر جھاڑو دینے کے بعد رسوئی صاف کر رہا تھا۔

گوردوارے کے بیرونی دروازے پر کسی کے مکّوں کی آواز سُنائی دی۔ ست سنگھ جھاڑو رکھ کر اپنی داڑھی کو کھجلاتا، دروازے کی طرف بڑھا اور بولا "کون ہے؟"

اس نے زنجیر کھول دی۔ جگّا اندر آ گیا۔ اندھیرے میں وہ بہت طویل قامت دکھائی دے رہا تھا۔ سارا دروازہ اس کی ضخامت سے پٹا ہوا تھا۔

"کیوں جگت سنگھ جی؟ اس وقت یہاں کیسے تشریف آوری ہوئی ہے؟"
ست سنگھ نے پوچھا۔

"بھائی" اس نے آہستہ سے کہا "میں گورو کی برکات لینے آیا ہوں،
"پڑھ دو میرے لیے دو اک"۔

"لیکن اب تو میں نے گرنتھ صاحب سنتوکھ کر رکھ دی ہے" ست سنگھ بولا۔
"ایسی کون سی جلدی ہے تمھیں؟"

"کوئی بات نہیں اگر سمیٹ دی ہے"۔ جگّے نے بے صبری سے کہا اور پھر اس نے ست سنگھ کے کندھے پر اپنا بھاری بھرکم ہاتھ رکھ کر کہا، "پڑھ دو میرے لیے دو اک جلدی جلدی"۔

ست سنگھ نے بڑبڑا کر اسے رستہ دے دیا۔ "آج تک گوردوارے کا مُنہ نہیں دیکھا۔ اب جب کہ مہاراج کا وجود آرام کر رہا ہے اور لوگ سوئے ہوئے ہیں تو تم کہتے ہو کہ مجھے گورو کا واک لے دو۔ کبھی یوں بھی ہوا ہے؟ اچھا، میں جپ جی صاحب کی ایک پوڑی، پڑھ دیتا ہوں"۔

"کچھ بھی پڑھ دو، پڑھو تو سہی"۔

ست سنگھ نے ایک لالٹین کی لو بڑھائی۔ دھوئیں سے اٹی چمنی میں روشنی ہونے لگی۔ وہ لالٹین لے کر منجی صاحب کے پیچھے بیٹھ گیا۔ جگّے نے مورچھل اٹھا کر ست سنگھ کے سر پر ہلانی شروع کر دی۔ ست سنگھ نے ایک سادہ سے رومال سے جپ جی کی جلد نکالی،

ماتھے سے لگائی اور اسے کھول کر جو سامنے آیا، پڑھنا شروع کر دیا۔

راتیں رُتی تھتی وار
پون پانی اگنی پاتال
تِسو وِچ دھرتی تھاپ رکھی دھرم سال
تِسو وِچ جی جگتی کے رنگ
تِن کے نام انیک اننت
کرمی کرمی ہوئے وچارو
سچا آپ، سچا دربارو
تِتھے سوہنی پنچ پروان
ندری کرم پوے نسانو
کچ پکائی اوتھے پائی
نانک گئیاں جاپو جائی

ست سنگھ نے صحیفہ بند کر کے پھر ایک بار پیشانی سے لگایا اور منہ زبانی اختتامی اشلوک پڑھنے لگا:

پونو گوروبانی پِتا
ماتا دھرتی مہتو
دِوَس سوراتی دوئی

اور پھر دھیرے دھیرے اس نے باقی کا اشلوک منہ ہی منہ میں الاپنا شروع کر دیا۔

جگتے نے مور چھل رکھ کر گرنتھ صاحب کے سامنے ماتھا ٹیکا۔ "یہ واک اچھا ہے نا؟" اس نے سادہ لوحی سے ست سنگھ سے پوچھا۔

"گوربانی سبھی اچھی ہے" ست سنگھ نے بڑے ایقان سے جواب دیا۔

"مطلب کیا ہے اس کا؟"

"تم نے اس کے مطالب سے کیا لینا ہے؟ بس گورو کی واک ہے۔ اگر تم کسی نیک کام پر روانہ ہو رہے ہو تو گورو تمھارا مددگار ہوگا اور اگر تم کسی بُرے کام کے لیے نکلے ہو تو گورو جی تمھیں روک دیں گے اور اگر تم پھر بھی برائی سے باز نہ آئے تو گورو جی تمھیں سزا دیں گے اور جب تم اپنے کیے پر پچھتاؤ گے تو وہ تمھیں معاف کر دیں گے۔"

"ٹھیک ہے میں نے معافی سے کیا لینا ہے؟ اچھا بھائی جی، ست سری اکال۔"

"ست سری اکال" بھائی نے جواب دیا۔

اقبال کو وہسکی کی خالی بوتل کے ساتھ سویا چھوڑ کر وہ گوردوارے سے چلا گیا۔

"عمر کے آخری حصے میں اچھے بھلے آدمی کا دماغ چل جاتا ہے۔" ڈپٹی حکم چند کے دماغ میں یہ جملہ بار بار گونجنے لگتا۔ اس نے اسے بھلانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اسے پھر یاد آجاتا۔ "متاہلانہ زندگی کے پچاسویں برس کسی آدمی کا عورتوں کے پیچھے دوڑتے پھرنا پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے؟ وہ سوچتا، اس لڑکی کے ساتھ سونا جو عمر میں اس کی بیٹیوں کے برابر ہو اور ساتھ ہی بازاری عورت، یہ تو بالکل مضحکہ خیز بات تھی لیکن چیزیں اس کی گرفت سے باہر نکل رہی تھیں اور وہ بھی اور خبطی سا ہوتا جا رہا تھا۔

صبح کے وقت اقبال اور جگے کو رہا کرنے کے احساس نے اسے جو خوشی دی تھی وہ اب رخصت ہو چکی تھی۔ اب اس پر بڑھاپا، پریشانی اور خبط طاری ہونے لگے تھے۔ اس نے ایک بدمعاش اور سماجی کارکن کو بلا سوچے سمجھے ہی رہا کر دیا تھا۔ وہ دونوں تو خود اس سے بھی گئے گزرے تھے۔ اگرچہ کئی کارکن بڑے حوصلہ مند بھی ہوتے ہیں لیکن یہ بیچارہ بڑا کتابی کیڑا ہی تھا، کرسی پر بیٹھنے والا، اس سے کیا کارہائے نمایاں سرزد ہوں گے؟ وہ لوگوں کے کچھ نہ کرنے پر کڑھتا رہے گا بس۔ بدمعاش اگرچہ بدمعاش ہی تھا لیکن تھا ڈھیٹ۔ اس نے گاڑیاں لوٹی تھیں، کاریں روکی تھیں، ڈکیتی کی وارداتیں کی تھیں اور قتل بھی کیے تھے۔

وہ دولت کی توقع کے بغیر کچھ نہیں کرتا۔ زیادہ سے زیادہ وہ ملیچھ سے جھگڑا کرے گا۔ اگر وہ کہیں بھاگ گیا اور فسادیوں کے ساتھ شامل ہو گیا تو گاڑی کی لوٹ کھسوٹ میں حصہ لے گا۔ ایسے لوگ تو کبھی عورتوں کے لیے جانیں نہیں وارتے، اگر نور اں نہ رہی تو وہ کسی اور لڑکی کو سنبھال لے گا۔

ڈپٹی حکم چند کو اپنے اوپر اور بھی غصہ آنے لگا۔ کیا یہ کافی تھا کہ اس کا کام دوسرے کرتے پھریں؛ یہ تو مجسٹریٹ کا کام ہے کہ امن و امان قائم رکھے۔ وہ کس طرح کا ڈپٹی یا مجسٹریٹ تھا؛ مجسٹریٹ بھی تو کسی طاقت کے بل پر ہی امن قائم رکھ سکتے ہیں؛ دلی میں نئی سرکار اپنی قربانیوں کے بلند بانگ دعوے کر رہی ہے۔ ہاں نئے حکمرانوں نے بڑی قربانیاں دی ہیں اور بہت سے لوگوں نے بھی دی تھیں ــــ ۱۴ر اگست کو آزادی کے دن،

ایک سندری تھی حکم چند کے اردلی کی بیٹی۔ اس نے گوجرانوالہ جاتے ہوئے قربانی دی تھی۔ ابھی اس کی شادی کو صرف چار دن ہی ہوئے تھے۔ اس کی بانہیں ابھی سرخ رنگ کی چوڑیوں سے ڈھکی تھیں اور اس کے ہاتھوں کی مہندی ابھی جوبن پر تھی۔ ابھی تو وہ اپنے پتی منشا رام سے کھل بھی نہیں پائی تھی۔ ان کے رشتہ داروں نے انھیں آپس میں بات چیت کا موقع ہی کہاں دیا تھا؛ اس نے گھونگھٹ کی اوٹ سے ہی منشا رام کا منہ دیکھا تھا ذرا دیر کے لیے۔ ۱۴ر اگست کو منشا رام اُسے گوجرانوالہ لے جا رہا تھا جہاں وہ چپراسی لگا ہوا تھا اور جہاں سیشن کی کچہری میں ہی اس کا ایک کمرے کا کوارٹر تھا۔ وہاں اسے پوری آزادی تھی۔ اسی لیے وہ موٹر میں بیٹھا مسافروں سے بات چیت کر رہا تھا اور اپنی نو بیاہتا پتنی کی طرف زیادہ دھیان نہیں دے رہا تھا۔ ایک موقع پر سبھی لاپروائی کا اظہار کیا کرتے ہیں۔ وہ بھی تو بالکل بے رُخی سے بیٹھی تھی۔ چپ چاپ گھونگھٹ نکالے ہوئے "اپنے آپ اپنے بازو سے کوئی چوڑی نہ اتارنا، یہ بدشگونی ہوتی ہے" اس کی سہیلیوں نے اسے کہا تھا۔ "اپنے آپ ہی ٹوٹنے دینا سہاگ رات کو" اس کی ایک بانہہ میں درجن درجن چوڑیاں تھیں۔ کہنیوں تک اس کی باہیں ڈھکی ہوئی تھیں۔ اس نے ان پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ وہ بہت سخت تھیں۔ ان کا ٹوٹنا کون سا آسان تھا؛ اور پھر موٹر ایک دم رک گئی۔ سڑک پر بڑے بڑے پتھر ہی پتھر پڑے تھے اور پھر سیکڑوں آدمی انھیں

باہر نکلنے کا حکم دینے لگے۔ سکھوں کو بس دیکھتے ہی ختم کر دیا اور جن کے بال کٹے ہوئے تھے۔ ان کے ازار بند کھول کر پڑتال کی گئی۔ منشا رام کو اس کی آنکھوں کے سامنے برہنہ کیا گیا۔ منشا رام کو جس کو اس نے ابھی پوری طرح دیکھا بھی نہیں تھا اور پھر اس کے سہاگ کا سرخ جوڑا ایک ایک کر کے ڈھتا رہا، جو دیکھتا توڑنے لگ جاتا۔ اس نے خود کوئی چوڑیاں نہیں اتاری تھی، کہیں بدشگونی نہ ہو جائے۔

سندر سنگھ کی بات دوسری تھی۔ حکم چند نے اسے خود ہی فوج میں بھرتی کرایا تھا۔ وہ بہت بہادر سکھ تھا، برما، اریٹریا اور اٹلی کے ان گنت تمغے تھے اس کے پاس سرکار نے اسے سندھ میں انعام کے طور پر ایک مربع زمین دی تھی۔ اس نے اپنی قربانی کا ڈی میں دی بیوی، بچوں سمیت۔

ساٹھ کے قریب مسافروں کے لیے بنے ہوئے ڈبے میں کوئی پانسو عورتیں اور مرد ٹھنسے ہوئے تھے۔ کمرے میں ایک ہی بیت الخلا تھا۔ اس کا پانی بھی ختم ہو چکا تھا اور میلوں تک کسی کو پانی میسر نہ آسکا۔ دھوپ تھی اور ریت تھی۔ سبھی اسٹیشنوں پر برچھا بردار لوگ آہنی باڑ کے پیچھے کھڑے تھے اور پھر گاڑی ایک اسٹیشن پر چار دن تک کھڑی رہی۔ کسی کو باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ سندر سنگھ کے بچے پانی اور روٹی کے لیے ترستے رہے، باقی لوگوں کا بھی یہی حال تھا۔ سندر سنگھ نے انھیں پینے کے لیے اپنا قارورہ دیا اور پھر وہ بھی ختم ہو گیا۔ اس نے اپنا پستول نکالا اور سب کو ختم کر دیا۔ اس سے اپنے بچوں کا دکھ برداشت نہ ہو سکا۔

بھورے گھنگھریالے بالوں کے جوڑے والا چھ سالہ ششکار سنگھ بھوری بھوؤں والی چار سالہ دیپو اور چار ماہ کی امرو۔ اس نے سب کو ٹھکانے لگا دیا۔ امرو اپنی ماں کی چھاتیوں کو چوستی ہوئی انھیں کاٹ کاٹ کھاتی تھی اور جب وہ زور لگاتی تو اس کے معصوم ماتھے پر سلوٹیں کھنچ جاتیں اور پھر سندر سنگھ نے اپنی بیوی کو بھی مار دیا اور پھر وہ گھبرا گیا۔ اس نے اپنی پستول کی نالی اپنی کنپٹی پر رکھی لیکن لبلبی نہ دبا سکا۔ اپنے آپ کو مارنے کی کیا ضرورت تھی۔ گاڑی چل پڑی تھی۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں کی لاشیں چھوڑ کر ہندوستان

آگیا۔ اس نے کوئی قربانی نہیں دی تھی۔ صرف اس کے اہل خاندان نے ہی دی تھی بس۔
حکم چند بہت غم زدہ تھا۔ رات امڈ آئی تھی۔ دریا میں مینڈک ٹرانے لگے تھے۔
بھنورے برآمدے میں لگی یاسمین کی جھاڑی کے گرد منڈلانے لگے تھے۔ بیرا وہسکی لے آیا۔
تو ڈپٹی صاحب نے واپس بھیج دی۔ بیرا کھانا لایا تو اس نے وہ بھی نہ کھایا۔ اس نے لال ٹین
گل کروادی اور خود تاریکی میں بیٹھا سوچوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا رہا۔
اس نے رقاصہ کی لڑکی کو واپس چندر نگر کیوں جانے دیا؟
"کیوں؟" اس نے خود سے سوال کیا اور اپنے ماتھے پر مٹھی سے دستک دی۔
اگر وہ اس وقت اس کی ہم بستر ہوتی تو وہ کسی کی پروا نہ کرتا۔ خواہ یہ پوری دنیا غرق ہو
جاتی۔ لیکن آج وہ یہاں نہیں تھی، گاڑی میں تھی۔

اسے گاڑی کی گھٹی گھٹی آواز سنائی دی۔
گیارہ بجے کے بعد چاند نکل آیا تھا۔ چاند بھی تھکا ماندہ اور افسردہ نظر آتا تھا۔
اس کی تھکی تھکی مدھم اور زرد چاندنی میدانوں پر اتر آئی تھی۔ زرد چاندنی میں ہر شے
داغ داغ لگ رہی تھی۔ پل کے قریب یہ روشنی بہت کم تھی۔ گاڑی کی اونچی پٹڑی نے
اندھیرے کی ایک دیوار سی تان رکھی تھی۔
سگنل کے قریب مشین گنوں کے لیے ریت کی جو بوریاں رکھی گئی تھیں۔ وہ پٹڑی
کے دونوں طرف بکھری پڑی تھیں۔ سگنل کا کھمبا ایک بہت بڑے سنتری کی طرح پہرا دے
رہا تھا۔ اوپر تلے دو بڑی بڑی سرخ بھیانک آنکھیں چمک رہی تھیں۔ سگنل کے دونوں بازو ایک
دوسرے کے متوازی تنے ہوئے تھے۔ کنارے پر اگی جھاڑیاں ایک بہت بڑے جنگل کی طرح
دکھائی دے رہی تھیں۔ دریا سے کسی قسم کی چمک نہیں اٹھ رہی تھی، یہاں ایک لوح کی سیاہی
دکھائی دے رہا تھا یا کہیں کہیں سے اٹھتی موجوں کی جھلک پڑتی تھی۔

پٹڑی سے کچھ فاصلے پر، جھاڑیوں کے جھنڈ کے پیچھے ایک جیپ کھڑی تھی۔ جس کا انجن گڑگڑا رہا تھا۔ جیپ میں کوئی نہیں تھا۔ جیپ میں آنے والے باہر نکل کر پٹڑی کے دونوں طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بیٹھ گئے تھے وہ اپنی رائفلیں اور برچھے اپنی ٹانگوں کے درمیان رکھے ہوئے سرینوں کے بل بیٹھے تھے۔ پُل کے پہلے آہنی باڑ کے ساتھ ایک موٹا رسّہ اُٹھا بندھا دکھائی دے رہا تھا۔ یہ پٹڑی سے کوئی بیس فٹ بلند تھا۔ اندھیرا اتنا تھا کہ کوئی ایک دوسرے کو پہچان بھی نہ سکتا تھا۔ اس لیے وہ اونچی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔

"چپ، سنو" کسی نے کہا۔

سب نے سنا، کچھ نہیں تھا، سرکنڈوں میں سے ہوا گزر رہی تھی۔

"تب بھی چپ رہو" لیڈر نے انتباہ کیا "اگر تم لوگ اسی طرح باتیں کرتے رہے تو ریل کی آواز وقت پر نہیں سن سکو گے۔"

وہ کھسر پھسر سی کرنے لگے۔

جب سگنل کا ایک بازو گرا تو پُل کے کانپنے کی عجیب سی آواز آئی۔ اس کی بیضوی آنکھ سرخ سے سبز ہو گئی۔ کھسر پھسر بند ہو گئی۔ سب لوگ اٹھ کر پٹڑی سے دس گز پیچھے نشانے لگا کر بیٹھ گئے۔

اور پھر ہلکی ہلکی پھٹ پھٹ کے ساتھ گاڑی کے چلنے کی آواز آئی۔ ایک آدمی دوڑ کر گیا اور اس نے ریل کی پٹڑی پر کان رکھ دیے۔

"آجا، لوٹ آ، بیوقوف" لیڈر نے بھینچی ہوئی آواز میں چیخ کر کہا۔

"گاڑی ہے گاڑی" اس نے پٹڑی سے کان ہٹا کر اونچی آواز میں کہا۔

"واپس لوٹ آؤ" لیڈر نے غصے میں کہا۔

سبھی کی آنکھیں اس دھندلے سے خلا میں گڑ گئی تھیں جس سے گاڑی برآمد ہو رہی تھی۔ اگر گاڑی تیز ہو تو یہ آہنی رسّہ بہت سے لوگوں کو یوں دو نیم کر دیتا جیسے چاقو سے کھیرے کو چیرا جاتا ہے۔ وہ جھنجلا گئے تھے۔

اسٹیشن سے بہت دور روشنی کا ایک نکتہ سا دکھائی دیا، یہ بجھا تو دوسرا نکتہ

روشن ہوگیا اور پھر کئی نکتے قریب آتے گئے۔ گاڑی کے آگے آگے یہ نکتے ٹارچوں کی روشنی کے تھے۔ سبھی گاڑی کی آواز سننے لگے۔ پل پر کوئی بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔

ادھر ایک آدمی لوہے کے اُس پُل پر چڑھنے لگا۔ وہ اس وقت دکھائی دیا جب آہنی رسّے کی گانٹھ کے پاس پہنچ گیا تھا۔ انھوں نے سوچا کہ وہ گانٹھ کو دیکھ رہا ہے۔ وہ گانٹھ کو جنبش دے رہا تھا۔ یہ بہت کس کر لگائی گئی تھی۔ اگر انجن کا ماتھا بھی اس سے ٹکراتا تو اس سے رسّہ ٹوٹ سکتا تھا۔ لیکن یہ گانٹھ نہ کھل پاتی۔ آدمی آہنی رسّی کے اوپر لیٹ گیا۔ اس کے پاؤں گانٹھ کے پاس تھے، اس کے ہاتھ رسّے کے نصف تک پہنچ چکے تھے۔ کوئی بہت ہی لمبا آدمی تھا۔

گاڑی اور بھی قریب آ گئی۔ گاڑی کا انجن ادھ بجھے انگارے گراتا پٹری پر چلا آرہا تھا۔ اس کی پھٹ پھٹ گاڑی کے شور میں گم ہو چکی تھی زرد چاند کی چاندنی میں پوری گاڑی دکھائی دینے لگی۔ انجن سے لے کر گارڈ کے آخری ڈبے تک ریل کی چھت پر لوگوں کی ایک موٹی تہہ جمی ہوئی دکھائی دی۔

وہ آدمی ابھی تک رسّے پر تنا ہوا تھا۔

لیڈر نے اٹھ کر ایک زوردار جھڑکی ماری "اُتر آؤ، گدھے اُتر آؤ، مارے جاؤ گے اُتر آؤ!"

آدمی نے آواز کی طرف دیکھا اور اپنی کمر سے کرپان نکال کر رسّے پر مارنی شروع کر دی۔

"یہ کون ہے، کیا کرتا ہے ... ؟"

ان کے پاس وقت نہیں ہے۔ انھوں نے پُل پر آتی گاڑی پر نظر ڈالی اور گاڑی سے پُل کے فاصلے کا اندازہ کیا۔ آدمی پوری طاقت سے رسّے کو کاٹ رہا تھا۔

لیڈر نے اپنی بندوق کندھے پر رکھی اور فائر کر دیا۔ اس کا نشانہ ٹھیک بیٹھا اور ایک ٹانگ رسّے سے نیچے لٹکنے لگی۔ دوسری ابھی تک رسّے کے گرد لپٹی تھی اور وہ بڑی تیزی سے کاٹ رہا تھا۔ انجن دس پندرہ گز دُور تھا اس میں سے انگارے نکل کر آسمان کی جانب پرواز

کر رہے تھے۔ کسی اور نے ایک فائر کیا۔ آدمی کا جسم رسّے سے لڑھک گیا اور وہ تلوار چلانے کی پوزیشن کھو کر اپنی ٹھوڑی اور ہاتھوں کے سہارے لٹکتا رہا۔ پھر وہ ذرا سا اوپر کو اچھلا اور رسّے کو اپنی بغل میں لے کر پھر سے اس پر وار کرنے لگا۔ رسّے کی کئی لڑیاں کٹ چکی تھیں صرف ایک ہی سخت سی لڑی باقی تھی۔ پہلے اس نے چاقو نکال کر چاقو کا وار کیا اور پھر دانتوں سے جھنجھوڑنے لگا۔ انجن بھی اس کے لٹکتے جسم پر چڑھنے کو تھا۔ گولی پر گولی چل رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ ملٹری کی گولی اس نا شناخت شدہ آدمی کو لگتی وہ کانپ کر گر گیا۔ رسّے کے دونوں برابر برابر سرے دونوں طرف پُل پر لٹکنے لگے۔

گاڑی کا انجن اس کے اوپر سے گزر گیا۔ ایک ایک کر کے باقی ڈبّے بھی گزر گئے۔ جگت سنگھ گاڑی کے نیچے پُرزہ پُرزہ ہو گیا اور مسلمان مہاجرین کو لے کر جانے والی گاڑی پاکستان کی طرف بڑھتی گئی۔

(ختم شُد)

خشونت سنگھ

اس ناول کے مطالعے کے بعد آپ خشونت سنگھ کے طرزِ نگارش کی داد تو دیں گے ہی، لیکن یہ کافی نہیں۔ بہترین داد یہ ہوگی کہ ہم اپنے دل کو ٹٹولیں۔ کسی نہ کسی گوشے میں جگت سنگھ ضرور چھپا ہوگا، جس طرح وہ دس نمبری جگے کے دل میں چھپا ہوا تھا۔ اگر ہمارے دلوں میں چھپا ہوا یہ جگت سنگھ بیدار ہو جائے تو موجودہ ماحول کی سب تلخیاں از خود ختم ہو جائیں گی۔ صحیفے یہی کام کرتے ہیں۔ یہ ناول بھی اس قابل ہے کہ اسے صحیفے کے طور پر پڑھا جائے۔

— گوپال متل